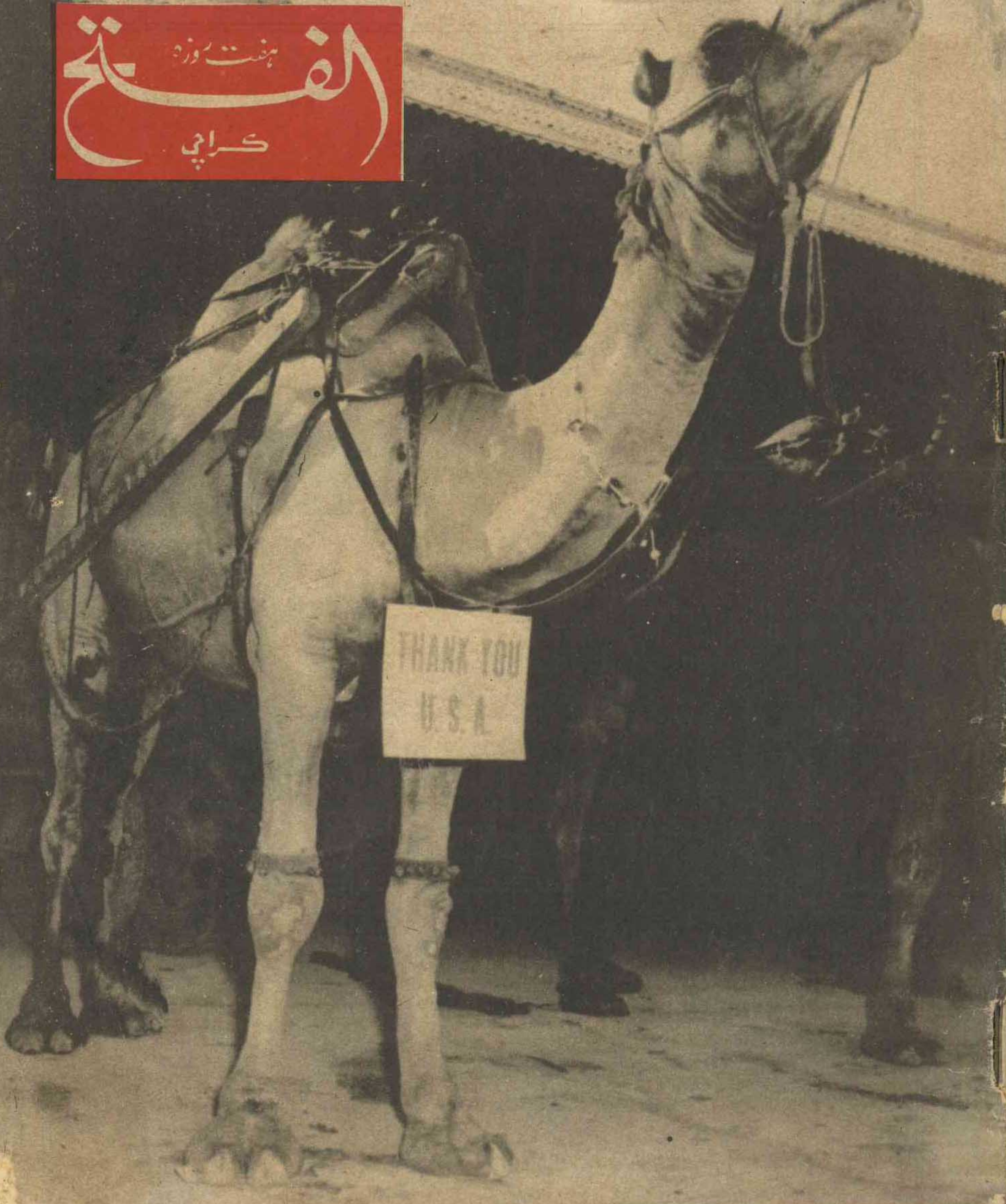
ہفت روزہ
الفتح
کراچی



۵ - ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲

امریکی امداد اور سیاسی ردّوبدل

**

"یقین، ایماں، رسول، یزداں ــــ عباد، عبدل، حقوق، انساں
دعا، عبادت، ثواب، تقویٰ ــــ خلوص، نیت، جبین، سجدہ
طلب، تمنّا، حیات، حسرت ــــ ریا، حقیقت، وفا، محبت
لہو، پسینہ، زمیں، دہقاں ــــ غریب، مفلس اور عہد و پیماں۔"
یہ لفظ وہ ہیں جو مر چکے ہیں
یہ لفظ وہ ہیں کہ جن کا ماتم ہزار صدیوں سے ہو رہا ہے۔
یہ لفظ وہ ہیں کہ جن کی قبروں پہ اب معانی کا اک شجر بھی
کہیں پہ سایہ فگن نہیں ہے
یہ لفظ وہ ہیں کہ جن کی قبروں کی خشک مٹی گذرتے لمحوں کے موسموں کی تپش سے ڈھل کر
پگھل چکی ہے
یہ لفظ وہ ہیں جنہیں پرانی لُغت کے کیڑے تمام ہڈیوں سمیت کب کے نگل چکے ہیں
یہ لفظ وہ ہیں کہ جن کی قبروں کے کالے پتھر بھی مر چکے ہیں
کہ ان پہ لکھی ہوئی عبارت بھی مٹ چکی ہے
مگر مجھے ہے یقیں کہ پھر سے یہ لفظ زندہ ضرور ہوں گے
کہ ان کے عیسیٰ کو بھی خدا نے
عطا کیا ہے وہی کرشمہ
وہ تازہ روحوں کا تازہ چشمہ
جو مردہ لفظوں کے خشک جسموں کو گرم خوں سے ہرا کرے گا
یہ لفظ زندہ ضرور ہوں گے
یہ لفظ اپنے معانی دیں گے
میں صبحِ نو کے ورق پہ لکھ کر یہ عہد کرتا ہوں آج ہی سے
"میں ایک ایسی لغت لکھوں گا
میں ایک ایسی لغت لکھوں گا
میں ایک ایسی لغت لکھوں گا"



صبحِ نو کا عہد

پروفیسر فضل حسین صمیم

اداریہ

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد ۳ ، شمارہ ۲۱

۵ — ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء

نگران
شوکت صدیقی

مدیر
ارشاد راؤ

نائب مدیر
وہاب صدیقی

بدل اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۵۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت: ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۵۰ درم
سعودی عرب: ۵ قرش۔ انگلستان ۴ شلنگ، ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح، ۸۰ ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس۔ کراچی، ۲۹

ایڈیٹر پبلشر:۔ ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

ٹیلیفون :۔ ۴۱۲۲۷۴

اختلافات کا حل

پچھلے دنوں سے پاکستان پیپلز پارٹی کے مرکزی وزیروں کے استعفوں اور بعض رہنماؤں کے درمیان باہمی اختلافات کا چرچا ہے۔ میاں محمود علی قصوری کا استعفا صدر بھٹو نے نامنظور کر دیا۔ جناب غلام مصطفیٰ جتوئی نے وزیر اعلیٰ سندھ جناب ممتاز بھٹو کے اظہارِ معذرت پر اپنا استعفا واپس لے لیا۔ جناب غلام مصطفیٰ کھر اور میاں قصوری کے درمیان سیاسی مناظرہ بھی پیش ہو چکا ہے اور اب ان پر عوام میں قیاس آرئیاں ہو رہی ہیں۔ حزب اختلاف حرکت میں آچکی ہے اور اس طرح غیر یقینی سیاسی حالات کو برقرار رکھنے کا عمل پوری شدت سے جاری ہے۔

یہ اختلافات موجودہ صورتِ حال میں مجموعی طور پر پوری قوم کے لئے نقصان دہ ہیں۔ جہاں اندرونی طور پر قومی زندگی کے ہر شعبے پر مضر اثرات مرتب ہوں گے، وہاں بین الاقوامی سطح پر صدرِ بھٹو کے لئے نئی دشواریوں اور الجھنوں میں اضافے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ولی خان پہلے ہی واویلا مچا رہے ہیں کہ "صدر بھٹو کی بجائے مجھ سے بات کی جائے۔ صدر بھٹو پہلے کی نسبت کمزور ہو چکے ہیں اور اس کے برعکس نیپ پر لوگوں کا اعتماد بڑھ رہا ہے"۔ لہذا پیپلز پارٹی کے رہنماؤں میں اختلافات ولی خان کے بیانات کو صحیح ثابت کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہم الفتح میں شروع ہی سے یہ بات کہتے آئے ہیں کہ پیپلز پارٹی کی تنظیم بہت کمزور ہے۔ اور اس کے نتائج بہت سنگین ہوں گے۔ چنانچہ اس بات کے آثار اب نمایاں ہو چکے ہیں۔ پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔ اگر حکومت کے ارکان پارٹی کی تنظیم کو نظر انداز کریں گے تو نوکر شاہی کے ہاتھ مضبوط ہوں گے اور جاگیردار اور سرمایہ دار عام لوگوں کی آرزوؤں کو کچلتے رہیں گے۔ اصل اقتدار پارٹی کے ان عام اراکین کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جنہوں نے اپنی برسوں کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا عکس پیپلز پارٹی کے منشور میں دیکھا تھا۔ پیپلز پارٹی نے انتخابات سے قبل اپنے منشور میں عوام سے بہت سے وعدے کئے تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کے عظمت کے نعرے لگائے تھے، لیکن عملی طور پر جاگیردار اور سرمایہ دار، نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ سے اب تک حکومت کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو چاہیئے کہ وہ عوام پر اعتماد کرے۔ اگر عوام پر اعتماد نہیں کیا جائے گا تو پیپلز پارٹی میں اندرونِ خانہ یونہی سازشیں ہوتی رہیں گی اور اندرونِ ملک انتشار بڑھتا جائے گا۔

عوام کو ساتھ لئے بغیر کوئی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ تاریخ کا ایک اٹل قانون ہے۔ ایوب خاں اور یحییٰ خاں کا حشر سب کے سامنے ہے۔ عوام عملی صورت میں اپنے مطالبات کی تکمیل چاہتے ہیں۔ انہیں کھوکھلے نعروں سے زیادہ عرصے تک بہلایا نہیں جا سکتا

سرورق کی کہانی

ایک مرکزی وزیر حکومت کو عوام کی حمایت سے محروم کرنا چاہتے ہیں

پاکستانیو!

امریکہ نے پھر امداد دی — ہوشیار رہنا

—— الفتح رپورٹ ——

امریکہ اس سال پاکستان کو ۶ کروڑ ۹۶ لاکھ ڈالر کی مالیت کا ۱۱ لاکھ ٹن گندم دے گا۔ یہ پی ایل ۴۸۰ پروگرام کا حصہ ہے۔ پی ایل ۴۸۰ —— چھوٹے، پس ماندہ اور نیم ترقی یافتہ ممالک کی آزادی، خودمختاری خریدنے کا سب سے مؤثر ہتھیار —— پاک امریکہ سمجھوتے کے مطابق ہمیں اس گندم کی قیمت کا صرف ۵ فی صد نقد ادا کرنا پڑے گا۔ باقی رقم قسطوں میں، ۴۰ سال کے اندر زرِ مبادلہ کی صورت میں ادا کرنی ہوگی —— جی ہاں وہی پرانا حساب کتاب گندم لو اور عزتِ نفس کا خیال ترک کر دو، کیونکہ وہائٹ ہاؤس کا حکم تمہارے یہاں بھی چلے گا۔

حالیہ امریکی امداد میں بظاہر کوئی ایسی بات نہیں کہ اہلِ وطن انگشت بدنداں رہ جائیں۔ اس قسم کی امداد تو ۲۵ سال سے جاری ہے۔ ۲۵ سال سے عوام کو سڑا ہوا امریکی گندم کھلایا جا رہا ہے۔ اور زبردستی انکل سام کی شان میں قصیدے پڑھائے جاتے رہے۔ ماضی میں برسرِ اقتدار آنے والی حکومت امریکہ بہادر کے گُن گاتی رہی اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے امریکی حکمتِ عملی کے سامنے سر جھکاتی رہی، جس کے نتیجے میں ہم اس سرزمین پر ۲۵ سالوں سے امریکی گندم کے کرشمے دیکھ رہے ہیں۔ نئے نئے ڈرامے، آخری خونی ڈرامہ تو بہت مہنگا پڑا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کوئی ایسا ویسا ڈرامہ نہیں جس کے تأثر کو اہلِ وطن آسانی سے فراموش کر دیں یہ زخم تو تادمِ مرگ تازہ رہے گا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ امداد ایک ایسی پارٹی کے دور میں قبول کی گئی جس نے حکومت بنانے سے قبل امریکی پالیسیوں اور حکمتِ عملی کی زبردست مخالفت کی تھی۔ امریکہ کی اس قسم کی مشروط امداد کی مذمت کی، سیٹو سنٹو سے علیحدگی کا نعرہ بلند کیا اور واشگاف الفاظ میں وعدہ کیا کہ پیپلز پارٹی اقتدار میں آنے کے بعد پاک امریکی تعلقات کا جائزہ لے گی اور پی ایل ۴۸۰ سے امداد لینا بند کر دے گی۔ لیکن اس سمجھوتہ سے یہ بات بھی کسی حد تک واضح ہو گئی کہ انکل سام کی گرفت سے نکلنا اتنا آسان نہیں جتنا ہم نے سمجھ لیا تھا۔ ۲۵ سال کی طویل مدت میں اکٹوپس نے پاکستان کے ہر شعبہ زندگی کو اپنی مضبوط اور خونی گرفت میں جکڑ لیا ہے۔ اس بدہیئت اور خونخوار درندے سے نجات حاصل کرنے کے لئے عوام کو طویل جد و جہد کرنی پڑے گی۔

کسی بھی ملک میں جب کوئی نئی پارٹی بنتی ہے تو اس میں بڑی طاقتوں کی نمائندگی کرنے والے تنخواہ دار ایجنٹ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور پارٹی جُوں جُوں آگے بڑھتی ہے۔ ان ایجنٹوں اور حواریوں کی سیاسی جوڑ توڑ اور سازشیں بھی زور پکڑتی جاتی ہیں۔ یہ تنخواہ دار ایجنٹ بتدریج پارٹی میں اپنا اثر بڑھاتے ہیں اور پھر پارٹی کی پالیسیوں اور حکمتِ عملی کو اپنی مرضی کے تابع بنانے کی جد و جہد کرتے ہیں۔ پیپلز پارٹی میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ امریکی سامراج کی نمائندگی کرنے والے پارٹی میں شامل ہونے کے بعد اپنا رنگ دکھا رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کو حکومت ملی تو اس میں شامل امریکی ایجنٹوں کا کردار مزید کھل گیا۔ ان کے چہرے سے اسلامی سوشلزم کا نقاب اتر گیا اور اب وُہ کھلم کھلا پارٹی کو، حکومت کو، امریکی سامراج کی گود میں بٹھانا چاہتے ہیں۔ ایک داڑھی اور ٹوپی والے مرکزی وزیر کے پچھلے دو تین ماہ کے بیانات کی چھان بین کی جائے اور ان کے قول و فعل کو حقائق کے ترازو پر تولا جائے تو ان کی سامراج نوازی آئینے کی طرح چمکنے لگتی ہے۔ یہ مرکزی وزیر قومی اور بین الاقوامی سطح پر حکومت کو سامراجی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اور اپنے تقاریر اور بیانات کے ذریعے حکومت کو بائیں بازو کے ترقی پسند عناصر کی حمایت سے محروم کر کے جماعت اسلامی کی سرپرستی میں دینا چاہتے ہیں۔ امریکی گندم کی امداد بلاوجہ نہیں دی گئی۔

یہ مرکزی وزیر اس قدر شیر بن چکے ہیں کہ اب انہوں نے اپنی تقریروں میں سوشلزم پر طنز و تشنیع کی بارش بھی شروع کر دی ہے۔ ایسی تمام باتیں کہنی شروع کر دی ہیں جو جماعت اسلامی کہتی آ رہی ہے۔

دیکھئے! پاکستان کے عوام کو اس امریکی امداد کے بدلے کس صورت میں معاوضہ ادا کرنا پڑے۔؟

ہم سہگل کے سرمایہ دارانہ ہتھکنڈوں کی مذمّت کرتے ہیں

۱۴ ستمبر کے شمارے میں ہم نے "دس ہزار طوائفیں خلیج عرب کی ریاستوں میں پہنچا دی گئیں" کے عنوان کے تحت سہگل کے یونائیٹڈ بینک کی وطن دشمن سرگرمیوں کو بے نقاب کیا تھا۔ ہمیں مختلف شہروں سے یہ شکایت موصول ہوئی ہے کہ وہاں بک اسٹالوں پر یہ شمارہ نظر نہیں آیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یونائیٹڈ بینک کی انتظامیہ نے اس شمارے کی ہزاروں کاپیاں خرید کر نذرِ آتش کر دی ہیں۔ تاکہ عوام کو ان کی مذموم سرگرمیوں کا علم نہ ہو سکے۔ ہم ان سرمایہ دارانہ ہتھکنڈوں کی مذمت کرتے ہیں اور زر کے پجاریوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ہم ان کے دباؤ میں نہیں آئیں گے اور وطن کی عزت و آبرو سے کھیلنے والے ہر شخص کا چہرہ بے نقاب کرتے رہیں گے، خواہ کتنی ہی بڑی قوت اس کی پُشت پناہی کر رہی ہو۔ (ادارہ)

کیا ہم جنگ کے لئے تیار ہیں

— ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ

بھٹو حکومت = دسمبر تک = مارچ تک

واقفِ حال

کیا ہم جنگ کے لئے تیار ہیں۔ ؟

برِصغیر میں پھر کشیدگی شدید ہوگئی ہے۔ بھارت نے ہماری اندرونی سیاسی صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر معاہدہ شملہ میں ایسی شقوں کو بھی شامل کر دیا ہے، جن کا پہلے کہیں ذکر نہیں تھا۔ بھارت فوجوں کی واپسی کو کشمیر میں کنٹرول لائن طے ہونے سے مشروط کر رہا ہے۔ حالانکہ معاہدہ شملہ کی دستاویز میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی۔ ان کالموں میں پہلے بھی یہ لکھا گیا تھا کہ ہمارے داخلی اختلافات اور اندرونی انتشار بھارت کو پھر شہ دے گا اور وہ اپنی من مانی شرائط عائد کرنا چاہے گا۔ جب صدر بھٹو مذاکرات کے لئے شملہ گئے تھے اس وقت انہیں قومی اسمبلی نے مکمل اعتماد کا ووٹ دیا تھا اور بھارت سے بات چیت کرنے کا اختیار بھی —— اسی اعتماد کی بنا پر انہوں نے کامیابی سے مذاکرات کئے اور ایک ایسا معاہدہ لائے جس میں پاکستان کو کچھ مل ہی رہا تھا۔ نقصان کچھ نہیں تھا بلکہ بھارت کو یہ نقصان تھا کہ اس کے ہاتھ سے پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ نکل رہا تھا جسے وہ سودے بازی کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ جن سنگھ اور خاصی دوسری پارٹیوں نے مسز اندرا گاندھی کی مخالفت بھی کی تھی۔ کہ انہوں نے کشمیر کا معاملہ طے کرائے بغیر ۵ ہزار مربع میل علاقہ کیوں پاکستان کو دے دیا۔ دہلی میں کئی مظاہرے بھی اسی سلسلے میں ہوئے۔ مسز اندرا گاندھی اب اس دباؤ سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اس فکر میں تھیں کہ کوئی موقع ملے تو وہ اپنے مخالفین کا منہ بند کرنے کے لئے کشمیر کا معاملہ اٹھائیں۔

ہمارے ہاں منتخب اکثریت نے تو معاہدۂ شملہ کو سراہا مگر غیر منتخب رہنماؤں نے اس کی پرزور مخالفت کی اور اسے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ قرار دیا۔ ۱۹۷۱ء کی شکست اور عظیم المیہ کے بعد ہمارا رویہ تبدیل ہو جانا چاہیئے تھا اور حقیقت پسندی رہنی چاہیئے تھی۔ مگر محض سیاسی مخالفت کی خاطر ہمارے ہاں لوگ جنونی انداز فکر استعمال کرتے ہیں۔ اور عوام کے جذبات کو استحکام اور تعمیر کے راستے پر ڈالنے کی بجائے اور مشتعل کر دیتے ہیں —— معاہدہ شملہ کے سلسلے میں قطعی طور پر یہ نہیں سوچا گیا کہ یہ معاہدہ پاکستان کے حق میں ہے اور بھارت کے خلاف۔ بھارت کسی نہ کسی وقت ضرور چاہے گا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کرے یا اس کی خلاف ورزی کرے۔ ہمارے ہاں اس کی مخالفت سے اُسے اور شہ ملی کہ صدر بھٹو اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ پوری قوم یک آواز ان کے پیچھے ہو۔ اس لئے اس وقت بعض مسائل کو اٹھایا جا سکتا ہے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ کشمیر کی سرحدوں پر جھڑپیں شروع



ہو چکی ہیں۔ ہمارے ہاں جو لوگ معاہدہ شملہ کے خلاف جذبات بھڑکا رہے تھے۔ اب درونِ خانہ یہ سوچتے ہیں کہ کیا ہم جنگ کے لئے تیار ہیں۔ ؟ جنگ ہوگئی تو کیا ہوگا۔ ؟

ہمارے خیال میں محض جذبات کے سہارے خوش فہمی میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں انتہائی بیرحمی سے حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ان پہلوؤں پر غور ضروری ہے۔

- ہماری اقتصادی صورتِ حال
- ہماری دفاعی تیاریاں
- ہماری بین الاقوامی دوستیاں اور رشتے
- ہمارا اندرونی سیاسی استحکام

اقتصادی صورتِ حال کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مزدوروں میں اب بھی بے چینی ہے۔ برآمدات میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اشیاء کی قیمتیں انتہائی گراں ہوگئی ہیں۔ بے روزگاری حد سے بڑھ گئی ہے ہمارے وزیرِ خزانہ ایک عرصے سے "بیمار" پڑے ہیں۔ یہ بیماری سیاسی ہے یا حقیقی۔ بستر علالت سے انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا ہے۔ لیکن بات حقیقت نہیں ہے۔ معیشت کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ سرمایہ دار اپنا سرمایہ باہر منتقل کر رہے ہیں، مزید سرمایہ کاری نہیں ہو رہی ہے۔ سرمایہ دار اور نوکر شاہی اس بات پر گٹھ جوڑ کر چکی ہے کہ سوشلسٹ معیشت کا نفاذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اِس کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ جب معیشت کی حالت یہ ہو اور سرکاری اخراجات پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے ہوں۔ ملک کا اکثریتی حصہ الگ ہو گیا ہے۔ اِس کے بعد وزرائے کرام و دیگر پرول کی فوج ظفر موج میں کچھ کمی ہونی چاہیئے تھی نہ کہ اضافہ —— وزارتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر وزیر یا سیکرٹری پر ماہوار کم از کم بارہ سے پندرہ ہزار روپے خرچ ہوتا ہے۔ اِس سے باقی اخراجات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ معیشت ابھی تک مستحکم نہیں ہو سکی ہے۔

دفاعی تیاریاں بھی معیشت سے الگ رکھ کر نہیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ معیشت مستحکم ہوگی، پیداوار مناسب ہوگی، تو دفاعی تیاریاں بھی کی جا سکتی ہیں، ہمارے ہاں تو چھوٹے چھوٹے پرزے تیار کئے جاتے ہیں اور بس —— بھارت میں ٹینک اور جہاز بھی بنائے جا رہے ہیں اور وہ اب انہیں برآمد بھی کر رہا ہے۔ ہم اسی فکر میں رہتے ہیں کہ برف گرنے لگ گئی تو چین ہمیں اسلحہ نہیں پہنچا سکے گا۔ چین پر کوئی فرض تو نہیں ہے کہ وہ ہماری امداد کرے۔ ہمیں خود بھی کچھ تیاری کرنی چاہیئے۔ چین نے اتنی مرتبہ جو کچھ سمجھایا ہے، اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا۔ جنگ کے لئے تو ہم ہمیشہ جنونیوں کی طرح تیار ہیں۔ چاہے جنگ بر سرِ اقتدار ٹولہ اپنے اقتدار کو طول دینے

الفتح

یہ عمارت، نوکرشاہی، پولیس اور چند شخصیتوں پر کھڑی ہے!

ہی کیوں ذکر رہا ہو، ہم اسے جہاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن درمیانی عرصے میں کبھی اس کے لئے تیاری نہیں کرتے۔ ملک کی بقا ہمارا پہلا مسئلہ ہے۔ جس کیلئے ہمیں معاشی طور پر عوام کو بھی مضبوط کرنا ہے اور فوج کو بھی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد سے اب تک دونوں میں سے کس کی تیاری ہوئی ہے۔ کتنے معاشی مسائل حل کئے گئے۔ کتنے عوام کو فوجی تربیت دی گئی۔ ایک شکست خوردہ فوج کی مکمل نئی تنظیم ہوتی ہے۔ تمام حکمتِ عملی تبدیل کی جاتی ہے۔ عوام اور فوج کے درمیان ایک گہرا ربط استوار ہوتا ہے۔ عوام کے حوصلے فوج کو حوصلہ دیتے ہیں اور فوج کے حوصلے عوام کو حوصلہ دیتے ہیں۔ اس کا کتنا اہتمام کیا گیا۔

بین الاقوامی صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے صدر محترم نے تیسری دنیا کے برق رفتار دورے تو کئے۔ ان دوروں کا یہ حاصل ضرور ہوا کہ ان ممالک میں سے دو تین کے علاوہ کسی نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا۔ اپنی جگہ یہ بھی بڑی بات ہے۔ لیکن ان دوروں سے بھارت پر کیا اثر پڑا۔؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ صدر بھٹو نے انتہائی تیز رفتاری سے دورے کر لئے۔ مگر ان دوروں سے حاصل شدہ نتائج اور پیدا شدہ اثرات کو ہمارے سفارت خانوں نے مستحکم نہیں کیا۔ عوامی حکومت قائم ہونے کے بعد سفارتخانوں میں جن تبدیلیوں کی توقع کی جا رہی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی عمل میں نہیں آئی۔ سفارت خانے اسی طرح عیاشی کے مراکز ہیں ریٹائرڈ سیاست دانوں اور جرنیلوں کی عزت گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان ابھی تک بین الاقوامی طور پر سفارتی تنہائی کا شکار ہے۔ ایسے میں اگر جنگ ہوئی تو اس کا کیا حاصل ہوگا۔؟ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

ان تینوں ادوار کے علاوہ بنیادی بات اندرونی سیاسی استحکام ہے۔ وہ بھی اس وقت ہمیں میسّر نہیں ہے۔ حزبِ اختلاف پر تو استحصالیوں اور رجعت پرستوں کا قبضہ ہے ہی ـــ وہ تو اپنے سیاسی مفادات کے لئے جنون پھیلا رہے ہیں۔ نیپ دو صوبوں میں حکمران ہے مرکز میں اپوزیشن میں ہے۔ اس کے اپنے سیاسی مفادات اور اپنی بین الاقوامی لائن ہے۔ وہ تمام امور سے قطع نظر اسی لائن کو لئے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس لائن کی انتہا بھارت سے کنفیڈریشن تک اور روس کی علاقائی تحفظ کی اسکیم تک ہوتی ہے پیپلز پارٹی جس میں عوام کی خاصی تعداد شامل تھی، اور جو چاروں صوبوں میں یکساں مقبولیت حاصل کر سکی تھی۔ اس پر محض وزیروں اور گورنروں نے قبضہ کر لیا اور کارکن جو اس کی روح تھے، وہ اس سے کٹ گئے ہیں۔ الیکشن میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے ضرور جیتی تھی لیکن اُسے جن خامیوں کا احساس ہونا چاہیئے تھا اور جن کی تلافی ضروری تھی اُسے نظر انداز کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کو اکثریت صرف سندھ اور پنجاب میں حاصل ہوئی تھی، سرحد اور بلوچستان میں نہیں۔ سیاسی تدبر کا تقاضا تھا کہ سرحد اور بلوچستان میں اس کی تنظیمی سرگرمیاں تیز ہو جاتیں۔ وہاں چونکہ یہ پارٹی اپوزیشن میں تھی اس لئے اس کی وسعت اور پھیلاؤ کے زیادہ امکانات تھے۔ مگر ان علاقوں میں پارٹی سطح پر کام کرنے کی بجائے وزراء کی سطح پر کام کیا گیا جس سے عوام قریب نہیں آسکے۔ سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی نے الیکشن ضرور جیتا تھا مگر اُسے مجموعی طور پر ۳۸ فی صد ووٹ ملے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ووٹروں کی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ اس لئے ان میں بھی کام کرنے کی ضرورت تھی تاکہ جو لوگ ابھی تک قریب نہیں آئے وہ بھی قریب آتے۔ اسطرح پوزیشن اور مستحکم ہو جاتی۔ لسانی فسادات اور دوسرے ہنگاموں میں اپوزیشن کی کامیابی کی وجہ بھی یہی تھی۔

آج کل پیپلز پارٹی کے مختلف گروہوں کے اختلافات بھی ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ وزیروں کے استعفے، وزیروں کی آپس میں محاذ آرائی، وزیروں اور گورنروں کے جوابی بیانات ـــ اختلافات کا اظہار ہی ہیں۔

سو یہ اندرونی سیاسی استحکام کی کیفیت ہے۔؟

ایسے حالات میں اگر جنگ ہو گی، تو سوچنا یہ ہے کہ ملک کا کیا بنے گا۔؟

ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اس وقت جنگ کا جنون پھیلانے والے اور جنگ کے نعرے بلند کرنے والے باقی ماندہ پاکستان کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں پاکستان جنگ کے لئے تیار نہیں ہے۔ بھارت پوری طرح تیار ہے اور ہم سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ صرف اسلحہ اور ہتھیاروں کی بات نہیں ہے ـــ اسلحہ ہتھیار نہ ہوں تو بھی قوم جنگ کر سکتی ہے۔ مگر یہاں تو آپس میں اتحاد بھی نہیں ہے۔ بھارت سے جنگ کون چاہتا ہے؟ لڑے گا کون ـــ پنجاب اور پنجاب کے بھی کچھ حصوں میں اس کے لئے آمادگی ہے۔ بلوچستان، سرحد اور سندھ میں بھارت کے خلاف جذبات کی وہ شدت نہیں ہے جو پنجاب میں ہو گی۔ جب ایک ملک میں اتنی فکری یک جہتی نہیں ہے اور اس مسئلے پر نہیں ہے اور اس دشمن کے خلاف نہیں ہے جس سے جنگ کا جنون، پھیلایا جا رہا ہے۔ تو پھر پاکستان جنگ کا کس طرح متحمل ہو سکتا ہے

صدر بھٹو اس وقت عوام اور اپنے کارکنوں سے کٹ جانے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ انہوں نے حکومت کو صرف پولیس اور بیوروکریسی سمجھ رکھا ہے۔ اور پیپلز پارٹی کو وزیروں اور محض سنٹرل کمیٹی تک سمجھ لیا ہے۔ انہوں نے شعوری طور پر کارکنوں کا کنونشن بلانے سے اجتناب برتا ہے۔ اس کی وجہ پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل مسٹر جے اے رحیم بھی ہیں۔ عوام سے کسی پارٹی کا رابطہ کارکنوں کے ذریعے ہوتا ہے ـــ کارکنوں سے رابطہ ٹوٹ جائے تو کسی بھی پارٹی کی قیادت خلاء میں معلق ہوتی ہے۔ اور اُسے راستے سے ہٹانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس خلاء کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپوزیشن اور بیوروکریسی کبھی دسمبر اور کبھی مارچ تک کا وقت دے رہی ہے۔

صدر بھٹو اگر ابھی تک اس زعم میں ہیں کہ عوام ان کے اب بھی پرستار ہیں، تو یہ محض خوش فہمی ہو گی، کیونکہ عوام کے مسائل میں کمی کی بجائے اور اضافہ ہوا ہے، وہ کب تک اس طلسم کا شکار رہیں گے۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ان کے منتخب نمائندے جواب وزارتوں پر فائز ہیں، وہ اپنے عزیز و اقارب کے لئے کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں لیکن عام آدمی کو جو ظلم اور استحصال کی چکی میں پس رہا ہے، اس کو صرف دستخطوں سے ٹرخا دیتے ہیں۔ اپوزیشن عوام کی اس بے چینی سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ملک گیر سیاسی مہموں کے ذریعے حکومت کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔ حکومت اس کا سیاسی سطح پر جواب دینے کی بجائے وزیروں کو استعمال کرتی ہے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ "سرکاری ذرائع" سے عوام کا اعتماد اُٹھ چکا ہے اسے بحال کرنے میں وقت لگے گا۔

صدر بھٹو۔ پر تاریخ نے بہت بڑی ذمہ داری عاید کی ہے باقی ماندہ پاکستان کے چھ کروڑ باشندوں کی زندگی کا دارومدار ان کے فیصلوں پر ہے۔ بعض اوقات تاریخ کروڑوں افراد کی زندگی موت کی ذمہ داری ایک شخص کے ہاتھوں میں دے دیتی ہے۔ وہ ہاتھ اس وقت صدر بھٹو کے ہیں۔ انہیں تاریخ کی ذمہ داریوں کو سا[illegible]ے کر فیصلہ کرنا ہے۔ ان کے صوبائی اور مرکزی وزراء کچھ اچھی مثالیں قائم نہیں کر رہے ہیں۔ کھانے پینے کا دور ختم نہیں ہوا ہے۔ ملک میں اس حکومت کے خلاف یہ بے چینی اور احتجاج ہے۔ اسے دور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ صدر بھٹو کوئی اور رعایت رکھے بغیر بدعنوان وزیروں کو کابینہ سے نکال دیں۔ کارکنوں سے رابطہ پیدا کریں پیپلز پارٹی کے ضلعی اور صوبائی کنونشن فوری طور پر منعقد کریں۔ کارکنوں کی سیاسی تربیت کا انتظام کریں۔ اسی صورت میں ان کے اقتدار کو استحکام مل سکتا ہے، ورنہ تاریخ میں یہی لکھا جائے گا کہ صدر بھٹو کو ایک قوم کی تعمیر کی عظیم ذمہ داری ملی تھی، لیکن وہ اپنے تدبّر کے باوجود صرف دوست نوازیوں اور اقرباء پروریوں کی وجہ سے اس عظیم ذمہ داری کی تکمیل نہیں کر سکے۔



پاکستان میں الفتح کے نمائندے خالد عبدالغنی سے

احفاظ الرحمٰن کی خصوصی ملاقات



پاکستان، اردن میں مقیم اپنا فوجی عملہ واپس بلالے

۱۹۴۷ء میں یہودیوں کے پاس صرف پانچ فی صدر زمینیں تھیں

چند دن پہلے میں پاکستان میں فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم الفتح کے نمائندے خالد عبدالغنی سے واقعہ میونخ کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا وہ بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ انتہائی شائستگی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر، متوازن لب و لہجے میں میرے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔

"بعض لوگ کہتے ہیں، میونخ میں فلسطینی نوجوانوں نے غیر انسانی فعل کا ارتکاب کیا ہے۔"

خالد نے چونک کر میری طرف دیکھا "غیر انسانی فعل! بلیک ستمبر کے اراکین اسرائیلی کھلاڑیوں کو ہلاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کے بدلے اپنے ان ہموطنوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے جو آج اسرائیل کی جیلوں میں اپنے ناکردہ جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں — اگر وہ انہیں ہلاک کرنا چاہتے تو اسی وقت ہلاک کر سکتے تھے جب کہ وہ ان کی رہائش گاہ میں داخل ہوئے تھے — اس کے بعد بھی انہیں ایسا کرنے کے مواقع حاصل تھے، لیکن انہوں نے اس سے گریز کیا کیونکہ ان کا مقصد کچھ اور تھا — انہوں نے جرمن پولیس کو بار بار وقت دیا، انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ عاقبت نااندیش نکلے۔ فلسطینی نوجوانوں نے اپنے الٹی میٹم کی میعاد میں بھی اضافہ کر دیا تھا لیکن جرمن حکام کچھ اور ہی منصوبہ بنا رہے تھے۔ اور بالآخر انہوں نے اسرائیلی حکام کے ساتھ اسرائیلی کھلاڑیوں اور ہمارے دلیر گوریلوں کو ہلاک کر دیا۔ ہمارے نوجوانوں نے اسرائیلی کھلاڑیوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کیا جب تک کہ ان پر حملہ نہیں کیا گیا، جب تک کہ ان پر گولیوں کی بارش نہیں کی گئی۔ ان سے وعدہ شکنی کی گئی۔ ان کے پاس کوئی اور راہ نہیں تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانیت دوست فلسطینی گوریلے ہیں، نہ کہ اس کا پرچار کرنے والے۔"

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس واقعے سے فلسطینی عوام کی تحریک کو کوئی فائدہ پہنچا ہے۔؟"

"ضرور!" خالد نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "میونخ آپریشن نے فلسطینی عوام کے نصب العین کو آگے بڑھایا ہے۔ سامراجی اور صیہونی قوتوں کو فلسطینی انقلاب کی قوت کا اندازہ ہو جانا چاہیئے۔ میونخ کا واقعہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ فلسطینی عوام ثابت قدمی سے مسلح جد وجہد پر اصرار کر رہے ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔ ہم سامراجیوں اور ان کے پریس کے پروپیگنڈہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ہمیشہ فلسطینی عوام کے خلاف سازش کرتے رہے ہیں۔ اسرائیل کا فتنہ انہی کی پیداوار ہے۔ وہ اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے صیہونی قوتوں کو آگے بڑھا رہے ہیں اور فلسطین کے مسئلے کو مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ لیکن سامراج اپنے مکروہ عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ آج دنیا بھر کے مظلوم عوام ہمارے ساتھ ہیں۔ ویت نامی عوام کے خلاف مظالم پر آج ہر جگہ ان پر لعنت ملامت کی جا رہی ہے۔ افرو ایشیائی عوام تیزی سے آزادی کی تحریکوں کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ سامراجی قوتیں عوامی





امریکہ دنیا بھر کے عوام کا
سب سے بڑا دشمن ہے



تحریکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ تاریخ ہمیشہ اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتی رہی ہے۔"

"بعض لوگ کہتے ہیں فلسطینی دہشت پسندی کا شکار ہیں۔؟"

"یہ کون کہتا ہے، سامراجی اور اس کے ایجنٹ اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ ہم اپنا وطن واپس چاہتے ہیں۔ ہم اپنی زمین پر ہل چلانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا جُرم کیا ہے۔ ہم نے تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ مسلح جدوجہد ہی کے ذریعے انقلاب کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔ ہم نے بہت مظالم سہے ہیں۔ اب ہم کسی فریب میں نہیں آئیں گے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ ویت نام میں کوریا میں، فلسطین میں، کیوبا میں اور دنیا بھر کے انقلابی عوام کے خلاف کون دہشت پسندی کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ساری دنیا اس حقیقت سے آشنا ہے۔ نکسن فلسطینی عوام اور دنیا بھر کے انقلابی عوام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ امریکی حکومت ہر جگہ دہشت پسندی کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے لیکن وہ اس کا الزام انقلابی قوتوں کے سر دھرنا چاہتے ہیں۔"

یہ ایک غیر رسمی سا انٹرویو تھا۔

ہم بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے اور وہ بار بار اسرائیلی حکام کے مظالم کا ذکر کرتے رہے۔

"مقبوضہ علاقوں میں رہنے والے فلسطینوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے ہیں۔ انہیں قدم قدم پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ وہ عربوں کو خواہ وہ عیسائی ہوں یا دروز مسلمانوں کا ایک فرقہ اپنے سے نیچ سمجھتے ہیں۔ نسل پرستی کا جذبہ ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ وہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان یہاں تک کہ ایشیائی یہودیوں اور یورپی یہودیوں کے درمیان بھی امتیاز روا رکھتے ہیں۔ عربوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ اسرائیلی حکام انہیں صرف نچلے درجے کی ملازمتیں دیتے ہیں۔ ہمارے بہت کم بچے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ درسگاہوں میں تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ عربوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر رہے ہیں۔ عربوں کی زمینوں کی شرح پیداوار بہت پست ہے، کیونکہ انہیں جدید زرعی آلات فراہم نہیں کئے جاتے۔ برطانوی تسلط کے تیس سالہ دور میں بھی یہودی صرف ۱/۲ ۳ فی صد زمین خرید سکے تھے۔ وہ بھی برطانوی حکومت نے یہودی تنظیموں کو منتقل کی تھیں، عربوں نے خود نہیں بیچی تھیں۔ جب برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کے سامنے فلسطین کا مسئلہ پیش کیا، تو اس وقت بھی یہودیوں کے پاس چھ فی صد سے زیادہ زمین نہیں تھی۔ اس کے باوجود اقوام متحدہ نے ایک یہودی ریاست کے قیام کی سفارش کی، جو پورے فلسطین کی ۵۰ فی صد زمین پر محیط تھی۔

آج بیشتر زمینیں یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ اب تک یہودی حکومت لاکھوں فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے نکال چکی ہے اور وہ مختلف عرب ملکوں میں مقیم ہیں۔

جب برطانیہ نے فلسطین کا مسئلہ کھڑا کیا، اس وقت ۹۰ فی صد سے زیادہ فلسطینی عرب تھے۔ آج وہاں یہودیوں کی تعداد ۲۵ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اسرائیل میں رہنے والے تمام عرب سیکورٹی زون میں رہتے ہیں جہاں ان پر طرح طرح کی پابندیاں عاید ہیں۔ فلسطینیوں کے لئے پاسپورٹ کا حصول ناممکن ہے۔ اگر کوئی فلسطینی ایک ماہ کے لئے بھی باہر جاتا ہے تو اسے اس کے حق شہریت سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی یہودی یورپ یا امریکہ سے وہاں جاتا ہے تو اسے اُسی دن حق شہریت مل جاتا ہے اور اس کے لئے مستقل رہائش کا انتظام بھی ہو جاتا ہے۔ ماہ بہ ماہ، سال بہ سال امریکہ اور یورپ سے بڑی تعداد میں یہودی اسرائیل آ رہے ہیں اور اس سے بھی بڑی تعداد میں فلسطینیوں کو ان کے ملک سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ وہ ہر شہر کے گرد زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں تاکہ فلسطینی حریت پسندوں کی سرگرمیوں کی روک تھام آسانی سے کر سکیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے یروشلم کے گرد جنین اور نابلس، غزہ اور حبرون کے ایک بہت بڑے رقبے پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ مسلمانوں کو مسجد الخلیل (حبرون) میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مسجد اقصیٰ کے گرد کھدائی کی جا رہی ہے۔ اس طرح وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔

یہودی سرمایہ دار امریکی سامراج کے گٹھ جوڑ سے ایک طویل عرصے سے یہ خونیں ڈرامہ اسٹیج کر رہے ہیں ۔۔۔ ۱۹۴۸ء میں دیر یٰسین دسمبر ۵۱ء میں الفراح، جولائی ۵۲ء میں ابوغوش، ستمبر ۵۳ء میں کفر قاسم، اکتوبر ۵۳ء میں القبعہ اور اکتوبر ۵۰ء میں عکرہ کے واقعات فلسطینی عربوں کے خلاف یہودیوں کے مظالم کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں پھر جب اسرائیلی فوجیں عرب ممالک پر حملہ کرتی ہیں تو وسیع



اسرائیلی فوجیوں کی بربریت کا منہ بولتا ثبوت

الفتح

اسرائیل میں

ایشیائی یہودیوں کے خلاف نفرت انگیز مہم

پیمانے پر نیپام بموں کا استعمال کرتی ہیں۔ اسرائیلی فوج بلا امتیاز بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو بڑی بے رحمی سے ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ میونخ میں ہلاک ہونے والے بیشتر یہودی کھلاڑیوں کا تعلق اسی خون آشام فوج سے تھا۔ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیلی فوجوں نے مصر کے خلاف جارحیت کی تو اسرائیلی فضائیہ نے بچوں کے ایک اسکول (بحرالبقر) اور ابوزعبل فیکٹری پر اندھا دھند بمباری کی جس سے سینکڑوں معصوم بچے اور مزدور شہید ہو گئے۔

مقبوضہ علاقوں میں ہزاروں حریت پسند جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں قید ہیں۔ اسرائیلی پولیس بات بات پر ان پر کوڑے برساتی ہے۔ قیدیوں کے رشتے داروں کو گرفتار کر کے ان کے سامنے لایا جاتا ہے۔ ان کی عورتوں کی عصمت دری کی جاتی ہے۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ ان پر ہر قسم کا نفسیاتی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کر لیں۔ ان کے ہاتھ باندھ کر کسی کھلی جگہ کھڑا کر دیتے ہیں اور انہیں خوف زدہ کرنے کے لئے ان کے سروں کے اوپر اور پاؤں کے قریب گولیاں برسائی جاتی ہیں۔ انہیں تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ڈال کر تعذیب کے آلات دکھائے جاتے ہیں — بعض قیدیوں کو پاگل پن کے انجکشن لگا دیئے جاتے ہیں جس سے وہ عمر بھر کے لئے ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس قسم کے انجکشن لگانے کے بعد قیدیوں کو سفید رنگ کا الکحل پلایا جاتا ہے جس سے وہ کچھ ہوش میں آجاتے ہیں اور ذہنی صلاحیتیں بحال ہونے لگتی ہیں۔ اس کے بعد ان سے ایک بار پھر سوال کئے جاتے ہیں۔ اگر قیدی اپنے "جرم" کا اعتراف کر لیتے ہیں تو اُسے اس الکحل کا ایک اور ڈوز دیتے ہیں اور اپنے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ثابت قدم رہتا ہے تو اُسے متنبہ کیا جاتا ہے کہ اگلی بار جب انجکشن لگایا جائیگا تو اسے الکحل نہیں دیا جائیگا اور وہ عمر بھر کے لئے پاگل ہو جائے گا۔

قیدیوں کے خلاف تعذیبی کارروائیوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہیں بالکل ننگا کر کے کوڑوں سے مارا جاتا ہے اور ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا جاتا ہے — قیدیوں کے ہاتھ پیچھے باندھ کر ان پر کتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ان کے ننگے جسموں پر سگریٹ بجھائے جاتے ہیں۔ کواڑوں میں قیدیوں کی انگلیاں پھنسا کر دروازے کو زور سے بند کر دیا جاتا ہے۔ پلاس سے ان کے ناخن کھینچے جاتے ہیں۔ انہیں مرچ کے انجکشن لگائے جاتے ہیں جس سے ان کے پورے جسم میں آگ سی پھیل جاتی ہے۔ انہیں کسی جگہ الٹا یا سیدھا لٹکا کر نیچے سے اُن کے ہاتھ یا پاؤں کھینچے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے بازو یا پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ کانوں کی لووں اور جسم کے دوسرے نازک حصوں میں بجلی کی لہر دوڑا دی جاتی ہے۔ قیدی کے منہ میں پائپ ڈال کر نلکا کھول دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور عیارانہ طریقہ یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر جیل میں قیدیوں سے بات چیت کرتے ہیں اور جھوٹی دستاویزات کے سہارے تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی "مدلل" گفتگو سے قیدیوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۶ جنوری ۱۹۶۸ء کے شمارے میں یروشلم پوسٹ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نابلس جیل کی ۶×۱۲ میٹر کوٹھڑی میں ۶۰ سے لیکر ۹۰ قیدیوں کو بند کیا جاتا ہے۔ انہیں چوبیس ۲۴ گھنٹوں کے بعد صرف ۵ منٹ کے لئے کھلی ہوا میں نکالا جاتا ہے۔ قیدیوں کے رشتے داروں کو اس بات کا علم نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ کہاں قید ہیں۔ اسرائیلی فوجیوں، شہریوں اور بچوں کو جیل کے اندر داخل ہو کر قیدیوں کا مذاق اڑانے کی اجازت ہے۔ دن میں تین بار قیدیوں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ جیل میں کوئی ڈاکٹر نہیں۔ ایک یہودی وارڈر مریض قیدیوں کو دوا دیتا ہے۔

خالد عبدالغنی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اب بتاؤ، ظلم و بربریت کا ڈرامہ کون کھیل رہا ہے۔ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم مسلح جدوجہد سے ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی پورا احساس ہے کہ یہ جنگ ایک طویل جنگ ہو گی۔ اور اس کے لئے ہم پہلے ہی سے تیاریاں کر رہے ہیں۔"

میں نے دھیرے سے کہا "فلسطینی انقلاب کو ضرور فتح حاصل ہو گی۔!"

فلسطینی مجاہد چھ سال سے بڑی عمر کے بچوں کو فوجی تربیت دے رہے ہیں۔ یہ ایک طویل جنگ کی تیاری ہے۔ اور جن لوگوں کا عزم اتنا پختہ ہو، بھلا انہیں کون شکست دے سکتا ہے۔

آخر میں میں نے جھجکتے ہوتے ان سے سوال کیا۔ "آپ پاکستانی قوم کے نام کوئی پیغام دینا پسند کریں گے۔؟"

انہوں نے کہا۔ "پاکستانی عوام اور پاکستان کی ترقی پسند تنظیمیں ہمیشہ ہمارا ساتھ دیتی رہی ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے وہ ہمیشہ ہمارے نصب العین کی حمایت کریں گی۔ انہوں نے ہماری جدوجہد کو اخلاقی اور مادی امداد فراہم کی ہے۔ پاکستان کے ترقی پسند عوام نے ہمارے ساتھ مظاہروں میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے اُردنی حکام کے خلاف مظاہرے کئے ہیں اور ان کی مذمت کی ہے۔ اردنی حکومت نے فلسطینی عوام کے خلاف ستمبر ء میں سب سے بھیانک



مسلح جدوجہد ہی کے ذریعے انقلاب کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے

جرم کا ارتکاب کیا تھا جب کہ ہمارے ۲۰ ہزار ساتھی شہید ہو گئے تھے۔ پاکستانی عوام نے ۱۹۶۹ء میں مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی کے موقع پر بھی ہمارے ساتھ مظاہروں میں حصہ لیا تھا۔ ہم ایک تاریخی اور روایاتی رشتے میں منسلک ہیں۔ اور غیر ملکی قوتوں، سامراج اور تمام رجعت پسندوں کے خلاف جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم مظلوم ہیں۔ پاکستانی عوام رجعت پسندوں اور جارحیت پسندوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان کی یہ جدوجہد سامراجیوں اور صیہونیت کے خلاف جدوجہد میں بہت بڑی مدد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں اپنے رشتوں کو اور زیادہ مضبوط کرنا چاہیئے۔ ہمیں متحد ہو کر تمام سازشیوں پر کاری ضربیں لگانی چاہئیں۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستانی عوام اور نئی عوامی حکومت فلسطینی انقلاب کی حمایت کرتی رہے گی۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستانی حکومت اردن سے اپنے تمام فوجی عملے کو واپس بلائے گی اور فلسطینی طلباء کو پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ مواقع فراہم کرے گی!"

وہاب صدیقی

پردہ چاک

ایوانِ صنعت و تجارت پر

لطیف ابراہیم جمال کے وظیفہ خواروں کا قبضہ

مینجنگ کمیٹی کے اجلاس میں
سیٹھ اکبر علی کو
ایک پُراسرار خط پیش کیا گیا

۲۶ ستمبر کی سہ پہر تھی۔ ایوانِ صنعت و تجارت میں کافی گہما گہمی تھی۔ کاریں ایوانِ صنعت و تجارت کے سامنے رُکتیں۔ ایک آدمی لپک کر کار کا دروازہ کھولتا بریف کیس ہاتھ میں لیے مجرّب جسم کار سے برآمد ہوتے اور ایوانِ صنعت و تجارت کی عمارت میں داخل ہو جاتے، کاروں کی آمد و رفت جاری رہی اور مجرّب جسموں کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا رہا۔ گجر نے چار بجنے کا اعلان کیا۔ گجر کی آواز سنتے ہی ـــــ عوام کے خون پر پلے ہوئے موٹے تازے جسم ایک کمرے میں چلے گئے۔ اور کمرے میں ایک طویل و عریض میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ چند منٹوں کے بعد سیٹھ اکبر علی قاسم کمرے میں داخل ہوئے اور کرسیٔ صدارت پر بیٹھتے ہی اجلاس کی کارروائی شروع کر دی۔

یہ ایوانِ صنعت و تجارت کی مینجنگ کمیٹی کا اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں سالِ رواں کے لیے ایوان صنعت و تجارت کے صدر، سینئر نائب صدر اور نائب صدر کا انتخاب ہونا تھا۔ اجلاس میں مختلف تجاویز زیرِ بحث آئیں۔ سیٹھ اکبر علی قاسم غور سے سب کی باتیں سننے کے بعد بولے ـــــ "حضرات، ہمیں اتفاق رائے سے صدر، سینئر نائب صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ کوشش کی جائے کہ یہ انتخاب بلا مقابلہ ہو۔ تاکہ ہم حکومت پر ثابت کر سکیں کہ ہماری برادری میں کوئی اختلاف نہیں، سب متحد ہیں، اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ رہنمائی کے لیے ہمیں اپنے مربّی اور محسن لطیف ابراہیم جمال سے رجوع کرنا چاہیئے، ان کے مشوروں پر عمل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہمارے غیر متنازعہ لیڈر ہیں۔"

ابھی ان کی تقریر جاری تھی کہ گلوری کلّے میں دبائے اور سیاہ ٹوپی لگائے ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ ایک سربمہر لفافہ اکبر علی قاسم کو دیا، ان سے سرگوشیاں کیں اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اکبر علی قاسم نے لفافہ کھولا۔ جیسے جیسے وہ پُراسرار خط پڑھتے جاتے تھے، چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوتے جاتے تھے۔ خط پڑھنے کے بعد انہوں نے حاضرینِ جلسہ سے کہا:-

"یہ ہمارے مربّی اور محسن لطیف ابراہیم جمال کا خط ہے
انتخابات کے سلسلے میں انہوں نے ہماری رہنمائی کی ہے میں
آپ کو یہ خط سناتا ہوں"

اس خط میں لطیف ابراہیم جمال نے قاسم عثمان کنڈا والا کو صدر، محمد عادل کو سینئر نائب صدر اور محمد مظفر کو نائب صدر نامزد کیا تھا اور مینجنگ کمیٹی کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان تینوں حضرات کی کامیابی کا اعلان کر دے۔ مینجنگ کمیٹی کے تمام ارکان نے لطیف ابراہیم جمال کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ کیونکہ یہ ارکان لطیف ابراہیم جمال کے حواری اور ایجنٹ تھے۔ ان کو مینجنگ کمیٹی کی رکنیت لطیف ابراہیم کی بدولت ہی ملی تھی۔ اس کے فوراً بعد اجلاس برخاست کر دیا گیا۔

ایوانِ صنعت و تجارت کے نو منتخب صدر مسٹر قاسم عثمان کنڈا والا میسرز کریسنٹ ٹریڈرز کے مالک ہیں۔ یہ ادارہ کس چیز کی تجارت کرتا ہے، کیا کاروبار ہے؟ یہ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ دفتر میں چند کرسیاں ہیں، میزیں ہیں، جہاں دن بھر گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ آج تک کوئی تجارتی مصروفیت دیکھنے میں نہیں آئی۔ کراچی کے تجارتی اور صنعتی حلقوں میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ قاسم عثمان کنڈا والا سیٹھ لطیف ابراہیم جمال کے وظیفہ خوار ہیں۔ بعض افراد کے مطابق لطیف ابراہیم جمال کی جانب سے قاسم عثمان کو مبلغ طور پر پانچ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔ اس شبے کو تقویت اس بات سے ملتی ہے کہ قاسم عثمان کنڈا والا کا کوئی صنعتی ادارہ ہے اور نہ کوئی بزنس ـــــ!

جہاں تک قاسم عثمان کنڈا والا کی قابلیت اور اہلیت کا تعلق ہے وہ پوری صنعتی اور تجارتی برادری میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ موصوف نے آج تک کسی تجارتی، صنعتی اور مالیاتی مباحثے میں حصہ نہیں لیا، کوئی منصوبہ پیش کیا اور نہ کوئی تجویز۔ ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ وہ لطیف ابراہیم جمال کے حواری ہیں اور اس کی "گڈ بکس" میں ہیں۔

سینئر نائب صدر محمد عادل، مسٹر محمد مسلم (میسرز فضل ویونگ فیکٹری) کے بھائی ہیں۔ لطیف ابراہیم جمال کے مصاحبِ خاص ہیں۔ دن بھر اس کے دفتر میں بیٹھے رہتے ہیں، اسی وجہ سے گزشتہ سال بھی سینئر نائب صدر بنائے گئے تھے اور اس سال بھی نامزد کیے گئے۔

نو منتخب نائب صدر محمد مظفر کارپٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں، اعلیٰ حکام سے یارانہ ہے اسی لیے انہیں نائب صدر نامزد کیا گیا ہے۔

۲۸ ستمبر کو ایوانِ صنعت و تجارت کی جنرل باڈی کا اجلاس ہوا۔ ایوان کے ایک رکن مسٹر حسین ناصر نے اجلاس میں "الفتح" کا شمارہ (۲۸ ستمبر، ۵ اکتوبر ۱۹۷۲)

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی بانی رکن مسز روز اسمتھ سے حامد ہاشمی کی خصوصی ملاقات



’’عورتوں کا معاشی اور سیاسی رتبہ بلند کرنے کیلئے متحد ہو جاؤ‘‘

(چیئرمین ماؤزے تنگ)

برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی بانی رکن مسز روز اسمتھ کے انٹرویو کی دو قسطیں پچھلے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر قسط میں انہوں نے برطانیہ کی انقلابی تحریک کی ناکامیوں کے اسباب کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ——— (ادارہ)

طارق علی

انقلابی کم

انارکسٹ زیادہ

اب کے جو میں شام کے بعد مسز اسمتھ کے ہاں پہنچا تو وہ کہنے لگیں ——— ’’جو نشست اپنے لیے زیادہ آرام دہ سمجھو اسے بیٹھنے کے لیے منتخب کر لو۔‘‘

’’یہ بات ہے تو میں بھی آپ والا نسخہ استعمال کرتا ہوں‘‘ میں نے کہا۔ چنانچہ میں نے بید کی نازک سی کرسی کھینچی اور چھوٹی سی چوکی پر پاؤں رکھ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ درمیان میں تپائی پر لیمن والی چائے کے گلاس رکھ لیے۔

’’کامریڈ آپ نے اپنی پارٹی کے ماضی کے کردار کی خاصی وضاحت کی ہے‘‘، میں نے بات کا آغاز کر دیا۔ ’’ماضی میں جھانکنے کی اس لیے ضرورت پڑتی ہے تاکہ حال کا ادراک حاصل ہو سکے کیا میں آپ سے یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ آج کی نشست میں برطانیہ میں انقلابی جدوجہد کی موجودہ صورتِ حال پر کچھ روشنی ڈالیں!‘‘

’’حامد! میں سمجھتی ہوں کہ مجھے موجودہ صورت احوال کے بارے میں فیصلے دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا!‘‘ اور کہنے لگیں ——— ’’پارٹی کے ماضی کی میں سرگرم کردار تھی۔ اس کے ساتھ میرا زندہ رابطہ تھا لیکن آج کی انقلابی تحریک کے ساتھ میرا تعلق محض علمی سطح کا ہے۔ اس ضمن میں کیونکر منہ کھولوں!

انکساری سچے انقلابیوں کا وصف خاص ہے۔ اہل چین کی روایات اس رنگ کو اور بھی ’’چوکھا‘‘ کر دیتی ہیں اور اسمتھ اسی اسلوب کو اختیار کیے ہوئے تھیں۔ ہمارے مابین جو گفتگو ہوئی وہ شاہد ہے کہ برطانیہ کی انقلابی تحریک پر ان کی نظر کتنی گہری ہے۔ میں نے اصرار کیا ——— ’’کامریڈ میں آپ

سوویت ترمیم پسند۔ انقلابی تحریک میں انتشار کے بانی

سے عدالت کا فیصلہ نہیں محض ذاتی تاثرات کا مطالبہ کر رہا ہوں، بالکل ایسے ہی جیسے ہم دوستوں میں بیٹھتے ہیں تو دنیا بھر کے موضوعات پر اپنی اپنی رائے دیتے ہیں۔ آج کی گفتگو میں صرف اس قدر فرق ہو گا کہ ہم شعوری طور پر اپنی بات چیت کو ایک خاص موضوع تک محدود رکھیں گے۔‘‘

روز اسمتھ مسکرا دیں ——— ’’مسئلہ یہ ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ وہاں تو اتنے بے شمار گروپ اور ہر گروپ کے اندر مزید اتنے چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں کہ بس انتشار ہی انتشار نظر آتا ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ خود یہ بھی ایک اہم موضوع ہے کہ آخر بائیں بازو کی تحریک میں ہر کہیں اتنا انتشار کیوں پھیلا ہوا ہے؟‘‘ میں نے لقمہ دیا ——— ’’ہم کیوں نہ برطانیہ کے حوالے سے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں اور ظاہر ہے کہ اس پر آپ ہی کچھ روشنی ڈال سکتی ہیں!‘‘ بات کا رخ متعین ہو گیا تھا۔ روز اسمتھ کہنے لگیں۔

——— ’’میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انتشار اور پراگندگی کے سوتے اس مایوسی سے پھوٹتے ہیں جو تبدیلی کی خواہشمند نئی نسل کو سوویت تحریف پسند حکمرانوں کے عمل و کردار سے ہوئی ہے۔ امریکہ اور مغربی یورپ کی نوجوان نسل ابھی تک بنیادی طور پر اسی سوشلزم اور انقلاب سے واقف ہے جس کا نمونہ آج کا روس اور مشرقی یورپ کے ممالک پیش کرتے ہیں۔ تحریف پسندی کی کمین گاہ میں چھپ کر انقلابی فکر و عمل کی اساس پر حملہ کرنے والے ان بدبختوں کے پاس رکھا ہی کیا ہے جو نئے دور کی پیاسی روحوں کو سیراب کر سکے۔ لہذا نئی نسل انہیں دور ہی سے سلام کر دیتی ہے۔ اس سے کچھ پیچھے لوٹ کر دیکھیں تو سوویت روس میں کامریڈ سٹالن کی قیادت میں پرولتاری حاکمیت کا خاصا طویل دور سامنے آتا ہے۔ بورژوا دانشور اور مغربی اجارہ دار سرمایہ داروں کے زرخرید سیاسی مفکرین ہمیشہ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ اگر وہ اپنی افترا پردازی کے ذریعے کامریڈ اسٹالن کے امیج کو بگاڑنے میں کامیاب ہو

وہ کامریڈ اسٹالن کی قدآور شخصیت کا بال تک بیکانہ کرسکے

جائیں تو اس کے ساتھ ہی ان کے لیے عوامی اور پرولتاری انقلاب کے تصوّر کو نہایت ہولناک بنا کر پیش کرنا زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ اس مکروہ مقصد کے حصول کے لیے ایک عرصہ سے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی یہ ادنیٰ سازشیں اسٹالن کی قدآور شخصیت کا بال تک بیکانہ کرسکیں۔ عوام اور انقلاب کے یہ کھلے دشمن ہمیشہ اپنے ہی زخم چاٹتے رہے۔ بدنہاد اعداء کی تمام ریشہ دوانیوں اور خود اپنی بعض بڑی غلطیوں کے باوجود اسٹالن کی طرح دار شخصیت دنیا بھر کے عوام کے لیے انتہائی محترم بنی رہی۔ لیکن جب گھر کے اندر سے سیندھ لگانے والے چور بیرونی ڈاکوؤں کے ساتھ مل گئے تو وہ وقتی طور پر اسٹالن کے کردار کے بارے میں مغرب کے نئے ذہن میں انتشار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اندرونی چوروں کا یہ تحریف پسند ٹولہ بین الاقوامی سامراج کی عدالت میں گویا سلطانی گواہ کا کردار ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے کامریڈ اسٹالن کی ــــــ

(CHARACTER ASSASSINATION)

کے لیے جتنے ذلیل حربے اختیار کیے ہیں ان کے تصور ہی سے ہر انقلابی کا خون کھول اٹھتا ہے۔ ان کا مقصد بھی عالمی سامراج سے مختلف نہیں تھا۔ یعنی یہ کہ ایک طویل دَور کی بین الاقوامی انقلابی جدوجہد اور اس کی قیادت پر سے نئے زمانے کے انقلاب پسندوں کا اعتماد اٹھ جائے۔ میرا قیاس ہے کہ مغربی یورپ اور امریکہ کی حد تک انہیں وقتی طور پر اپنے اس ناپاک مقصد میں جزوی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

انتشار اور بداعتمادی کی فضا میں نئی نسل کا ایک حصّہ اسٹالن کو REJECT کرنے کے بعد اس کے کسی زمانے میں حریف ٹراٹسکی کی طرف دیکھتا ہے۔ سامراجی پراپیگنڈہ مشین پھر اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اسٹالن کو بے رحم سفّاک، آمرِ مطلق، جذباتی عدم توازن کا مریض، بے حد وہمی اور شکّی مزاج، جنسی بے اعتدالیوں کا شکار اور پتہ نہیں کیا کچھ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ٹراٹسکی کو عظیم انقلابی، عظیم دانشور، تختۂ دار پر کلمۂ حق کہنے والا، زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں کا نقیب اور صداقت کی خاطر دردناک موت سے دوچار ہونے والا مظلوم دکھایا جاتا ہے۔ اس مکّارانہ پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر برطانیہ مغربی جرمنی اور فرانس میں نوجوانوں کی خاصی تعداد خود کو ٹراٹسکی کے ساتھ وابستہ کرنے لگی ہے۔ ان میں اکثریت ایسے نوجوانوں کی ہے جو بنیادی طور پر مخلص ہیں لیکن ان کا ذہن مسائل کے بارے میں واضح نہیں۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ ان کی صفوں میں عوام دشمن طبقوں کی طرف سے شاید کچھ ایسے لوگ پلانٹ بھی کیے گئے ہیں جو بنیادی طور پر بدمعاش ہیں۔ یہ بدمعاش لوگ انقلابی تحریک کو غلط نہج پر موڑنے اور انقلاب پسندوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ ایک غلط روایت یہ چل نکلی ہے کہ جب کوئی سے دو گروپ بعض مسائل پر متفق الرائے نہیں ہوتے تو وہ ایک دوسرے کو ٹراٹسکی کے چیلے کا خطاب دے کر اپنے غصّے کا اظہار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود کو کھلے بندوں ٹراٹسکی کے ساتھ منسوب کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ "برطانیہ کی تحریف پسند پارٹی کا کردار کیا ہے؟" روز اسمتھ کہنے لگیں ـــ "اس کا کردار اتنا ہی مایوس کن ہے جتنا ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مخلوق گراوٹ کی آخری حدود

تحریف پسند ٹولہ
بین الاقوامی سامراج کی عدالت
میں سلطانی گواہ بن گیا

کو پھلانگ چکی ہے۔ ٹریڈ یونین تحریک پر قبضہ انہیں ورثے میں ملا ہے۔ اب نئی سوچ ابھر رہی ہے تو ان کی گرفت آپ ہی آپ ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ ان کی ساری کوشش یہ ہے کہ یہ قبضہ قائم رہے۔ یورپ کے صنعتی معاشرے نے محنت کش کو یہ سبق دیا ہے کہ پارلیمانی طریقوں سے اقتصادی مطالبوں کی کشمکش میں میدان ہمیشہ غنیم کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ تحریف پسند چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ ٹریڈ یونین تحریک میں سیاست کے شجرِ ممنوعہ کو چھونے والے گردن زدنی ہیں۔ ان انتہا پسندوں کی بات مت سنو، ورنہ سرمایہ داری کی جنت سے نکال دیئے جاؤ گے۔ سیاسی محاذ پر یہ مسخرے اپنا سارا وزن ٹوری پارٹی کے بجائے لیبر پارٹی کے پلڑے میں ڈالتے ہیں۔ کہنے کو تو ان کا کہنا ہے کہ ہم لیبر پارٹی کو کمتر برائی کے طور پر قبول کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ ناگزیر برائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ساری سیاست بازی رجعت پسند لیبر پارٹی کے ہاتھ مضبوط کرنے سے آگے نہیں بڑھتی۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم تو لیبر پارٹی کے اندر بائیں بازو کی تقویت دینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں محض عوام کو دھوکہ دینے کی بھونڈی کوشش ہے۔ اس ضمن میں ان کی منطق بڑی مضحکہ خیز ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات میں لیبر پارٹی کا کوئی بدل موجود نہیں۔ اسے بتدریج بائیں بازو کی طرف جھکنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ ہم اس لیے اس جماعت کے ساتھ تعاون کرتے ہیں کہ اسے صرف اندر سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیبر پارٹی کو عوام دشمن بورژوا جماعت سمجھنے والوں کو برطانیہ کے تحریف پسند الٹرا لیفٹسٹ کا خطاب دے کر ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ سو عملی طور پر یہ "شرفا" معیشت پسندی سے بھی گر کر سوشل ڈیموکریسی کی قبر میں دفن ہو چکے ہیں۔

یہ پارٹی کیا ہے، اچھے خاصے "معزز" لوگوں کا اجتماع ہے جنہیں فیشن کے طور پر عوام سے ساتھ "مصلحانہ" ہمدردی ہے۔ جوں جوں عوام کی انقلابی تحریک کا تموّج بڑھ رہا ہے۔ ان کے نمائشی انقلابی فلسفوں کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ لوگ اب ان کی موٹی موٹی مارکسی اصطلاحات سے متاثر ہونے کی بجائے ان کے گندے اعمال کا جائزہ لینے لگے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں برطانیہ کی مزدور تحریک کے مزاج میں بڑی صحت مند تبدیلی آئی ہے۔ مزدوروں نے جدوجہد کے پرانے اسلوب کو چنداں مفید نہ پاتے ہوئے اسے خیرباد کہہ دیا ہے۔ اس پر تحریف پسند بڑے جزبز ہوئے ہیں۔ وہ اسے انتہا پسندوں کی کارگزاری سمجھتے ہیں اور انہیں پانی پی پی کر کوستے ہیں ان "معزز انقلابیوں" کے فکر و عمل سے صرف مزدور طبقہ ہی بیزار نہیں ہو رہا۔ خود پارٹی کے نچلی سطح کے کارکنوں میں بے حساب بے چینی ہے۔ نومبر ۱۹۷۱ء میں منعقد ہونے والی پارٹی کانگرس کی روئداد میں انہیں اعتراف کرنا پڑا ہے کہ پارٹی کی ممبرشپ بہت گر گئی ہے۔ چھوٹے کارکن کہتے ہیں کہ اس معکوس ترقی کی وجوہات تلاش کرنی چاہئیں۔ ان کا خیال ہے کہ پارٹی کی پالیسیوں میں ضرور کچھ بنیادی غلطیاں موجود ہیں۔ ان کا کھوج لگا کر ہی اس صورتِ حال کا تدارک ہو سکتا ہے۔ قیادت کارکنوں کے اس محاسبے پر بہت پیچ و تاب کھاتی ہے۔ اسے اصرار ہے کہ پارٹی کی پالیسی بدستور عین انقلابی ہے لیکن وہ اس بات کی کوئی وضاحت پیش نہیں کرتی کہ سب کچھ ٹھیک ہونے کے

برصغیر کے محنت کش
انقلاب کا پختہ شعور رکھتے ہیں



باوجود پارٹی ترقی کی بجائے تنزل کی راہ پر کیوں گامزن ہے چنانچہ جھنجلاہٹ میں پارٹی کے اندر ناقدین کو سخت سست کہہ کر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ادھر تو اور تحریف پسندوں کے ترجمان "سٹار" کی اشاعت بے حد گر گئی ہے۔ نومبر ۱۹۷۱ء میں منعقد ہونے والی پارٹی کانگرس میں اس پر سخت تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ اخبار کو کاروباری اعتبار سے نفع بخش بنانے پر بہت زور دیا گیا۔ اس کی اشاعت کو بڑھانے کے لیے وہی طریقے تجویز کیے گئے ہیں جو منافع کے کسی بھی کاروبار کے لیے تجویز کیے جا سکتے ہیں۔ کانگرس کی رپورٹ میں یہ اعتراف بھی ملتا ہے کہ الٹرا لیفٹسٹ نظریات کے پھیلائے ہوئے انتشار کی وجہ سے ان کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ تحریف پسندی کا اوپر ہی سے ملمع نہیں اتر رہا، اندر سے بھی اس کا بت ترخ رہا ہے!"

"کامریڈ! مارکسی، لیننی گروپوں کا کچھ مختصر سا ذکر ہو جائے؟" میرا اگلا سوال تھا — "اس انتشار میں کیا ترتیب کے بھی کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں؟"

"میں ہرگز مایوس نہیں ہوں!" روز کہنے لگیں "انتشار کی یہ کیفیت تاریخی عمل کا ایک حصہ ہے اور اس کی نوعیت عارضی ہے۔ یہ درست ہے کہ ٹراٹسکی کے چیلوں اور نراجیت پسندوں کی پھیلائی ہوئی گرد نے لوگوں کو بہت محتاط بنا دیا ہے۔ وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں اور باہمی اعتماد کی منزل تک پہنچنے کے لیے کچھ زیادہ ہی وقت لے رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھے لوگ بتدریج ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ دھند آہستہ آہستہ چھٹ رہی ہے اور حقائق کے خط و خال واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

میرے خیال میں برطانیہ میں سرگرم مختلف انقلابی گروپوں میں مارکسی، لیننی پارٹی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کے چیئرمین کا نام رگ برچ (REG BIRCH) ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں چین اور البانیہ ہی دنیا بھر کے عوام کو انقلاب کا صحیح راستہ دکھا رہے ہیں۔ کھل کر کہتے ہیں کہ بورژوا سماجی ڈھانچے کو گرا کر ہی پرولتاریہ کی حاکمیت کے تحت ایک نئے ترقی پسند معاشرے کی تعمیر ممکن ہے اور اس مقصد کے لیے لگی لپٹی کے بغیر انقلابی تشدد کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ لوگ ماؤزے تنگ کو مارکسزم، لینن ازم کا عظیم معلم مانتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ آج کے دور میں فکر ماؤزے تنگ ہی عالمی انقلاب کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک مزدور تحریک محض سیاسی جدوجہد کا وسیلہ ہے۔ بنیادی انقلابی محاذ نہیں۔ پارلیمانی انتخابات کو محض ڈھونگ سمجھتے ہیں چنانچہ ۱۹۷۰ کے عام انتخابات کے وقت اس پارٹی نے مزدوروں سے اپیل کی تھی کہ ریاستی اقتدار کو محض مراعات یافتہ طبقوں تک محدود رکھنے والے ان انتخابات کا بائیکاٹ کریں چنانچہ مزدوروں کی خاصی بڑی تعداد نے ووٹ نہیں ڈالے تھے۔ ان لوگوں نے اب مزدور طبقے کو جنرل لائن پر بھی تعلیم دینا شروع کر دی ہے۔

میرے قیاس کے مطابق ہنوز ان کے اسلوب کار میں کچھ کمزوریاں باقی ہیں۔ ان کمزوریوں کا سرچشمہ خلوص کا فقدان نہیں تجربے کی کمی ہے۔ مثلاً ابھی تک یہ پارٹی برطانوی معاشرے کے اندرونی اور بیرونی تضادات، اسی طرح بنیادی تضاد اور ثانوی تضادات کا مکمل اور صحیح تجزیہ نہیں کر پائی۔ پارٹی کی قیادت میں عوام کے وسیع تر متحدہ محاذ کے قیام کی بات بھی شاید ابھی تک پوری طرح ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اسی طرح خود ان کی اپنی سرگرمیوں کا اصل میدان ابھی تک ٹریڈ یونین تحریک ہے۔ انہوں نے کارخانوں پر چند روزہ قبضہ کر کے مزدوروں کے زیرِ انتظام آجروں کے لیے پیداوار میں اضافے کی جو روایت شروع کی ہے اس سے انقلاب کو براہِ راست کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچا۔ زیادہ سے زیادہ اس قدر ہوتا ہے کہ اپنی قوت اور صلاحیتوں میں مزدور کا اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ متذکرہ مارکسی لیننی پارٹی والے کمال سادگی سے مزدور جدوجہد کے اس نئے اسلوب کو گوریلا جنگ کا نام دیتے ہیں۔ تاہم چونکہ یہ لوگ بنیادی طور پر مخلص ہوتے ہیں اس لیے اپنی جدوجہد اور غلطیوں سے ہی سیکھ رہے ہیں۔ غیر دانستہ طور پر معیشت پسندی کے کچھ نہ کچھ رجحانات ابھی تک ان کے اندر موجود ہیں۔ اس گروپ کے ہفت روزہ ترجمان کا نام "دی ورکر" ہے

دوسرا اہم انقلابی گروپ "دی کمیونسٹ فیڈریشن آف برٹن" ہے۔ اس فیڈریشن میں متعدد چھوٹے چھوٹے گروپ شامل ہیں۔ اس لیے اس کا تنظیمی ڈھانچہ کسی قدر ڈھیلا ڈھالا ہے۔ نظریاتی ہم آہنگی کا بھی فقدان ہے۔ یہ لوگ تحریف پسندوں کے سخت مخالف اور مارکسی لیننی طرزِ فکر کے داعی ہیں۔ اصلاح پسندی کی شدومد کے ساتھ مذمت کرتے ہیں۔ مارکسی لیننی پارٹی کے مقابلے میں اس فیڈریشن کے نظامِ فکر میں معیشت پسندی کو کچھ زیادہ ہی دخل حاصل ہے مہم جوئی کا رجحان بھی کسی حد تک موجود ہے۔ یہ ایک عرصے سے برطانیہ میں ۱۹۲۶ جیسی جنرل اسٹرائک کرانے کے لیے فضا ہموار کر رہے ہیں، جب کہ مارکسی لیننی پارٹی اسے سعی فضول سمجھتی ہے۔ اس گروپ کے ہفت روزہ ترجمان کا نام "جدوجہد" (THE STRUGGLE) ہے۔

ایک اور گروپ مارکسی، لیننی دانشوروں پر مشتمل ہے۔ ان حضرات کی علمی سطح کی سرگرمیاں بنیادی طور پر دانشوروں کے حلقوں تک محدود ہیں۔ خود کو ڈسپلن کا پابند نہیں بنانا چاہتے۔ مضمون اور کتابیں لکھ کر یا مذاکروں وغیرہ کا اہتمام کر کے انقلاب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ مجھ کو روشن خیال اور درمیانے طبقے کے دانش وروں کی طبقاتی

کمزوری کے درمیان معلّق دکھائی دیتے ہیں - یہ اس حد تک ضرور مفید کام کر رہے ہیں کہ نوجوان نسل میں انقلابی نظریے کا ابتدائی سا ذوق پیدا کرنے میں ممد ہیں - ماہنامہ "دی مارکسٹ" (THE MARXIST) ان کا ترجمان ہے"۔

"کامریڈ! آخری بات یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ برطانیہ میں مقیم بے شمار غیر ملکیوں کا انقلابی تحریک کے سلسلے میں کیا روّیہ ہے؟"

غیر ملکیوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو دولت مشترکہ کے ترقی پذیر ممالک سے "تلاشِ روزگار کے سلسلے میں برطانیہ آئے ہیں" روز اسمتھ نے کہا "یہ لوگ کارخانوں، ملوں اور فارموں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ انہیں دوہری نفرت کا نشانہ بننا پڑ رہا ہے - ایک طرف تو نسلی منافرت ہے دوسری طرف سرمایہ دارانہ استحصال! لہٰذا یہ بیچارے سب سے زیادہ مظلوم ہیں اسی لیے شاید نسبتاً زیادہ آگے بڑھے ہوئے انقلابی شعور کے حامل ہیں - برصغیر کے مزدور خاصا اچھا کام کر رہے ہیں مانچسٹر میں پاکستان سے آنے والے مزدوروں کا یونٹ بڑا فعال ہے - ان کی سوچ بڑی منجھی ہوئی ہے - اسی طرح آئرش لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں - ان کے شعور کو تیز کرنے والا وہ تاریخی ظلم ہے جس کی بھاری چٹان ابھی تک ان کے سینوں پر پڑی ہے -"

"ہمارے ہاں کے ایک نوجوان طارق علی خان کی ادھر بڑی دھوم ہے اس کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟" میں نے استفسار کیا -

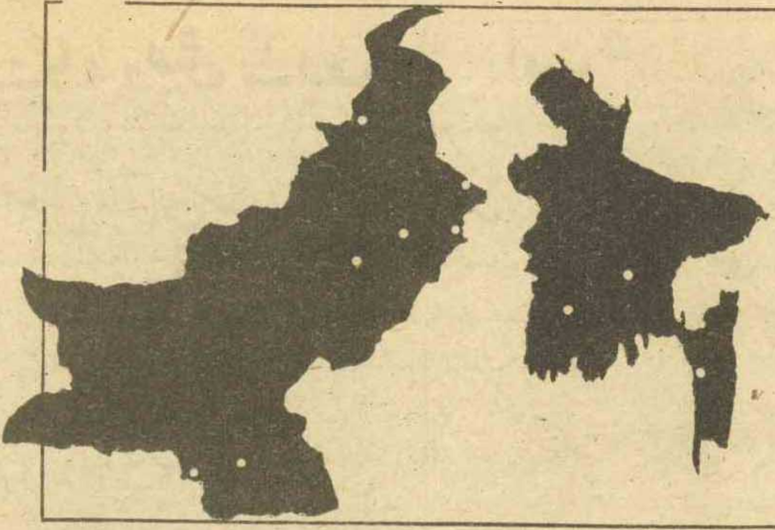
"میں نے طارق علی خان کے ایک دو ہنگامے دیکھے ہیں اس کی ایک دو تقریریں بھی سنی ہیں - مجھے اس نوجوان نے متاثر نہیں کیا - مجھے وہ انقلابی سے زیادہ انارکسٹ نظر آیا ہے - بس ناراض سا اور غیر شائستہ سا نوجوان ہے - میری مراد ہے کہ اس میں سیاسی متانت اور انقلابی سنجیدگی کا فقدان ہے، خودستائی اور خود نمائی اس کی ہر ہر حرکت سے پھوٹی پڑتی ہے - میں سمجھتی ہوں کہ اگر وہ انقلاب کا سائن بورڈ لگانے کی بجائے بیٹل بنا خوش فکروں کی طرح ناچتا گاتا پھرتا تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوتی - اس کی افتاد ہی کچھ ایسی دکھائی پڑتی ہے - یہ بات تو کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے کہ ذرائع ابلاغ کے بورژوا ادارے اس قسم کے نوجوانوں کی کمپنی کی مشہوری کے سلسلے میں اس قدر فراخدلی کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں"

رات کے گیارہ بج رہے تھے - میں نے خلوص دل سے مسز روز اسمتھ کا شکریہ ادا کیا اور شب بخیر کہہ کر چلا آیا

نسیم سحر

بے صدا آوازوں کا شور

حماقتوں اور عناتتوں کے غدود بڑھ کر
ہماری ہر چیز کھا گئے ہیں
اداس پیڑ اپنے اپنے سوکھے ہوئے تنوں میں غموں کا جلتا عذاب
لے کر گر پڑے ہیں
ہمارے بھوکے بدن تمہاری نحوستوں کی اذیتوں سے نڈھال
ہو کر مرے پڑے ہیں
ہمارے سُنسان گھر میں چمگادڑوں کی چیخوں کا شور ہے
جو ہمارے حلقوم کس رہا ہے
یہ گرنے والا مکان اجڑی ہوئی زمینوں میں
آندھیوں کے مہیب جھکوں میں بس رہا ہے
کہ آج بھی سازشوں کے سرطان گوشے میں جال پھیلائے
اونگھتے ہیں
کہ آج بھی چند جانور جنگلوں میں چھپ کر
مرا لہو
اشتہا کے نتھنوں سے سونگھتے ہیں.
ہر ایک چہرے پہ بے یقینی کی کیفیت ہے
کبوتر اپنے گھروں کے ویران آنگنوں میں اُتر بھی آئیں .
تو کیا فرق پڑ سکے گا لیکن
حرج بھی کیا ہے ،



پاکستان میں قومیت کا مسئلہ

مودودیے پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں

روس نواز عناصر کثیر القومی نظریے کا اطلاق بھارت پر کیوں نہیں کرتے؟

(صفدر میر)

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک پرانے اور پختہ کار صحافی کا ایک مضمون کچھ دن پہلے انگریزی کے ایک اصلاح پسند لبرل ہفت روزے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ آیا پاکستانی قوم واحد ہے یا محض کئی اقوام پر مشتمل ایک ریاست۔ یہ مضمون روسی اکیڈمی آف سائنسز کے پروفیسر گینکوفسکی کی کتاب "پیپلز آف پاکستان" (اقوام پاکستان) کی حمایت میں تحریر کیا گیا ہے۔

اس مضمون میں ہمارے دوست نے یہ بات جتانے کے لئے دستاویزاتی ثبوت جمع کئے ہیں کہ قومیتوں کا مسئلہ ہمارے لئے کوئی نیا نہیں ہے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ ہندوستان اور پاکستان کو بھی ——ہمیشہ سے کثیر القومی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ انہوں نے جن دستاویزات کا حوالہ دیا ہے وہ مولانا عبید اللہ سندھی کی کابل میں قائم کردہ سیاسی جماعت کا ۱۹۲۴ء کا مینی فیسٹو انڈین نیشنل کانگرس کی تیسری دہائی کی ایک قرارداد، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی چوتھی دہائی کی ایک قرارداد اور آخر میں میاں افتخار الدین کی ایک تقریر ہے۔ اس تاریخی تحقیق سے قاری کو یہ بتانا مقصود ہے کہ پاکستانی ایک قوم نہیں بلکہ کئی قوموں کا ملغوبہ ہے۔ تاہم اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ آیا اس اصول کا اطلاق ہندوستان پر بھی کیا جا سکتا ہے تاکہ ہم ایک متحد ہندوستانی قوم کی حقیقت کی نفی کر سکیں۔

ہمارے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دوست نے ایک عجیب الزام یہ لگایا ہے کہ پاکستانی دانشور اور سیاست دان اس سلسلہ میں حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔

آیئے! سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ کیا واقعی ہمارے دانشوروں پر حقائق سے گریز کرنے کا الزام درست ہے اور خاص طور پر اس حقیقت سے گریز کرنے کا کہ پاکستان ایک کثیر القومی مملکت ہے نہ کہ یک قومی ریاست۔

بہت سے لوگ یہ جانتے ہیں کہ پاکستان میں بائیں بازو کے ایک خاص مذہب فکر کے لوگ متذکرہ حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لہٰذا اس کا سامنا کرتے ہیں۔ عوامی ادبی انجمن اپنے مینی فیسٹو میں پاکستان کی کثیر القومی نوعیت (نہ کہ یک قومی حیثیت) کا راگ الاپنے میں مصروف ہے۔ اس مینوفیسٹو پر جن بائیں بازو کے دانشوروں کے دستخط ہیں ان میں فیض احمد فیض صاحب اور اُن کے مکتبہ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ مگر احمد ندیم قاسمی اور ان کے ساتھیوں نے اسے تسلیم نہیں کیا۔

مگر جس بات کو لوگ نہیں جانتے وہ یہ ہے کہ بائیں بازو کے دانشوروں کا یہ طبقہ پاکستان کے یک قومی نظریہ کی مخالفت میں تنہا نہیں، مولانا مودودی بھی پاکستانی قومیت کے خلاف ان لوگوں کے شانہ بشانہ صف آراء ہیں: دوسری چیزوں کے علاوہ اس بات سے جدلیاتی وحدانیت اور اجتماع ضدین کی تصدیق ہوتی ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں پاکستان کے اجزائے ترکیبی دوسری تفریق جغرافیائی نسلی اور لسانی بنیادوں پر ہے۔ اولاً پاکستان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر دو خطوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہ دونوں خطے اپنی اپنی جگہ جسد واحد ہونے کی بجائے مختلف حصوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان حصوں میں ایک دوسرے کے خلاف تعصبات ہیں۔ ہم اس وقت ایک قوم نہیں ہیں، بلکہ سندھیوں، بلوچوں، پٹھانوں، پنجابیوں اور بنگالیوں پر مشتمل پانچ مختلف اقوام ہیں جو مصنوعی طور پر ایک سیاسی وحدت میں مدغم کر دی گئی ہیں۔ ان سب اقوام میں علیحدگی پسندی کے رجحانات بڑی قوت سے کارفرما ہیں۔"

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۸ء)

لہٰذا دائیں اور بائیں بازوؤں کے دانشوروں پر یہ الزام غلط ہے کہ انہوں نے حقائق کا سامنا نہیں کیا اور خاص طور پر ان حقائق کا جن کا تعلق کثیر القومی مسئلہ سے ہے۔

نہیں —— پاکستان میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ دائیں اور بائیں بازو کے دانشور جس حقیقت کا سامنا کرنے کو تیار نہیں ہیں وہ دراصل پاکستان کی حقیقت ہے۔

مولانا مودودی کی امامت میں دائیں بازو کے دانشوروں نے پاکستان کی حقیقت کا سامنا کرنے سے اس وقت انکار کیا جب ۱۹۴۷ء میں یہ مملکت امکان اور تصور کی منزل سے گزر کر حقیقت اور ضرورت کی حدود میں داخل ہوئی۔

اس واقعے سے پیشتر مودودیئے پاکستان کے تصور کیخلاف جدوجہد کرتے رہے اور جب اس تصور نے حقیقت کا روپ دھار لیا تو ان لوگوں نے اپنی توپوں کے دہانے اس حقیقت کی طرف موڑ دیئے۔

بنگلہ دیش کے بعد ـــــ اب

مغربی پاکستان سیاسی طوفانوں کی زد میں

ستم ظریفی دیکھئے کہ یہی لوگ گذشتہ چند سالوں سے اپنے تئیں تصور پاکستان کے (جس کو انہوں نے نظریہ پاکستان کا نام دے رکھا ہے) سب سے بڑے علمبردار بن بیٹھے ہیں۔ مگر پاکستان کی حقیقت کے خلاف ان کا غیض و غضب جوں کا توں قائم ہے۔ یاد رہے کہ اس مملکت کے قیام کو انہوں نے ایک عفریت کی پیدائش کا نام دیا تھا۔ ان لوگوں نے نظریہ پاکستان کا جو ڈھونگ کھڑا کر رکھا ہے۔ یہ دراصل اسی "عفریت" کے مقابلے کے لئے ہے۔

مودودی گروہ کی سیاسی تگ و دو کے موجودہ دور میں ان لوگوں کی دشمنی اور کینہ کا نشانہ دو چیزیں بن رہی ہیں۔ اولاً مملکت پاکستان کی "جغرافیائی" حیثیت جس کے مقابلے میں "نظریاتی سرحدوں" کا فریب کھڑا کیا جا رہا ہے اور ثانیاً پاکستان کے عوام جن کے بڑھتے ہوئے سوشلسٹ رجحان سے اس ملک کے جاگیردار اور سرمایہ دار، سامراج اور ان سب کے حلیف مودودیئے بہت نالاں ہیں۔ ملک پر فوجی حکومت دوبارہ مسلط کرنے کے لئے جو نعرے پچھلے دنوں بلند کئے گئے وہ ان طبقوں کی اس مسلسل جدوجہد کی ایک کڑی ہے جو انہوں نے عوام سے ان کے جمہوری حقوق، چھیننے کے لئے سالہا سال سے شروع کر رکھی ہے۔ یہ لوگ جمہوریت کی حفاظت اس طرح کرنا، چاہتے ہیں۔

مگر عوام کی حقیقت بینی (اور خاص طور پر کثیر القومی حقیقت) کا سبق دینے میں بائیں بازو کے دانش ور بھی پیش پیش نہیں ہیں۔ اب تو دائیں بازو والے اور بورژوا اصلاح پسند (لبرل) بھی جبہ و دستار زیب تن کر کے عوام کے دلوں میں خوف خدا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کہیں حقیقتوں سے روگردانی کرنے کی پاداش میں ملک پر تباہی و بربادی نازل نہ ہو جائے۔

یہ حقیقتیں کون سی ہیں؟ آیئے! ہم ان سے روبرو ہوں اور اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لے لیں۔ جو کثیر القومی نظریہ کے داعی ہیں۔

پہلی بڑی حقیقت جو ہمارے سامنے آتی وہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں قومی زبانوں کی اکثریت کثیر القومی نوعیت کی حامل ہے۔ یہ بات ان ریاستوں کی سیاسی وحدت کے حق پر اثر انداز نہیں ہوتی اور نہ ہی کثیر القومی نظریہ کی آڑ ہے کہ کوئی ملک کسی ایسی ریاست کی آزادی اور یک جہتی پر اس نیت سے حملہ کرتا ہے یا ایسے حملہ کی حمایت کرتا ہے کہ اس ریاست کا سیاسی اتحاد پارہ پارہ ہو جائے یا اس کے حصے بخرے کر دیئے جائیں۔ بائیں بازو کے متعلق کثیر القومی نظریہ کے علمبردار خاص طور پر غور فرمائیں۔

کیا یہ اصحاب برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، سوویت یونین، یوگوسلاویہ اور اپنے ملک کے قریب تر۔ ہندوستان کے کثیر القومی مسائل کا حل بھی اسی طرح چاہیں گے۔

مگر فرق ہے کہ ہمارے بائیں بازو سے متعلق لبرل دوست جو کثیر القومی نظریہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا مقصد ایک مضبوط، مربوط اور ہمہ گیر قومی ریاست ـــــ یعنی پاکستانی قومیت ـــــ کی نفی کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ آیا پاکستان ایک قومی ریاست ہے یا کثیر القومی مملکت ہے۔

مثال کے طور پر کثیر القومی نظریہ کے پرچارکوں نے کبھی ہندوستانی قومیت پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے؟ حالانکہ ہندوستان قومی ریاست پاکستان سے کہیں زیادہ تعداد میں نسلی اور لسانی قومیتوں کا مجموعہ ہے۔ کیا بائیں بازو کے ہندوستانیوں یا ان کے پاکستانی دوستوں نے اس حقیقت کو بنیاد بنا کر ہندوستان میں صوبائی خود مختاری یا عدم مرکزیت یا علیحدگی کی تحریکیں چلائی ہیں۔؟ چاہے ان ـــــ کی صورت شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کی ہو یا ان کی جدید ترین تعبیر جو خان عبدالولی خان اور مفتی محمود پیش کر رہے ہیں۔

جب ہم ہندوستان سے متعلق حقائق کا جائزہ لے رہے ہیں تو کیا ہم ہندوستان کے مختلف علاقوں بالخصوص دراوڑی جنوب اور قبائلی شمال مشرق میں اچھی خاصی پھیلی ہوئی ان تحریکوں کو بھی تسلیم کریں گے، جو نوآبادیاتی، نسلی اور لسانی تغلب کے خلاف حق خود اختیاری کا مطالبہ کر رہے ہیں؟

کیا ہندوستان میں بائیں بازو سے متعلق لوگ اور ان کے پاکستانی اور روسی دوست بھارت کی ہمہ گیر قومیت سے ان علاقوں کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں یا یہ لوگ ہندوستانی ریاستوں کی دہلی کی مرکزیت میں کسی قسم کی ڈھیل کے قائل ہیں؟ وہ مرکزیت جس میں سامراج کا بکثرت استعمال شامل ہے۔

اب آیئے سوویت یونین کی کثیر القومی حیثیت کا جائزہ لیں۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ سوویت یونین میں سو سے زیادہ لسانی قومی طبقے ہیں اور روسی اس پر بظاہر بہت فخر کرتے ہیں۔ کیا ان سب لسانی اکائیوں پر مشتمل الگ ریاستیں قائم ہیں؟ کیا روس کی موجودہ ریاستوں میں سے کسی کو بھی ماسکو کی مرکزی طاقت سے اس قسم کی آزادی حاصل ہے جس کا پرچار پاکستان میں کیا جا رہا ہے۔؟

حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ سوویت یونین کے لیڈر اپنے ملک کی کثیر القومی حیثیت پر زور دینے کے باوجود روس کی مختلف النوع قومیتوں پر حاوی ایک ہمہ گیر قومی ریاست کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ملک کو ایک متحد قومی ریاست کے قالب میں ڈھال رہے ہیں۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی ۲۴ ویں کانگرس منعقدہ ۱۹۷۱ء میں پارٹی سیکرٹری کامریڈ بریزنیف نے اعلان کیا کہ "ہم سوویت ریاست کے قومی مفاد سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے۔"

بنیادی مسئلہ پاکستان میں قومیتوں اور ذیلی گروہوں کے وجود یا عدم وجود کا نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہ ان قومیتوں کی انفرادیت واضح ہے۔ جیسا کہ پروفیسر گینکوسکی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ قومیتیں اپنے وطن میں ایک دوسرے سے تقریباً الگ تھلگ آزاد قومی حیثیت کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

اگر یہ روسی عالم تھوڑی سی حقیقت پسندی سے کام لیتے تو ان پر حقیقت کا ایک اور پہلو بھی آشکارا ہوتا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ پاکستان کی ۵ ہزار سالہ تاریخ نے محض نسلی اور لسانی تجرد کی طرف ہی حرکت نہیں کی بلکہ ان صدیوں کے دوران مختلف قومیتیں منتشر ہو کر ایک دوسرے میں مدغم بھی ہوئی ہیں اور کچھ عرصے سے ایک قومی وحدت میں منسلک ہو رہی ہیں۔ مثلاً وہ یہ بھی دیکھ پاتے کہ پنجابی بولنے والے علاقوں میں وسیع پیمانے پر پختون، بلوچی اور کشمیری رچ بس چکے ہیں۔ سندھ میں پختون، بلوچی، براہوی اور اردو بولنے والے لوگ گھل مل گئے ہیں، اور یہ کہ بلوچستان میں آباد لوگ نہ صرف نسلی بلکہ لسانی اعتبار سے بھی بلوچوں سے مختلف ہیں یعنی پختون، براہوی پنجابی وغیرہ

اسے اس حقیقت سے بھی دوچار ہونا پڑتا کہ سرحدی صوبہ میں پختونوں کے علاوہ اور بھی کئی واضح نسلی اور لسانی گروہ آباد ہیں۔ مثلاً ہزارہ، ازبک، کافر، ہنزہ، پنجابی، کشمیری وغیرہ۔ یہ صوبہ پختونستان تحریک کی بنیاد ہے اور اصلاح پسند بائیں بازو سے متعلق لوگوں اور ان کے غیر ملکی دوستوں کو بہت عزیز ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے بائیں بازو کے لبرل اصحاب ایک بڑی قومی حقیقت سے پہلوتہی کر رہے ہیں۔ اور یہ حقیقت "ریاست ہائے ہندوستان" سے آزاد مملکت پاکستان کا وجود ہے۔ غیر ملکی فوجی طاقت کی مدد سے قائم شدہ بنگلہ دیش کی "حقیقت" کے بعد ان اصحاب کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ وہ پاکستان کی قومیتوں کی جداگانہ حیثیت اور علیحدگی پسند رجحانات

باقی صـ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

الفتح

ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے





اسرائیلی دہشت پسندوں نے انسانیت کو قتل کر دیا

نعیم الحسن

یہودی دہشت پسندوں نے پاپولر فرنٹ کے سرکاری ترجمان "الہدف" کے ایڈیٹر ان چیف غسان کنافانی کو انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے قتل کر دیا۔ اس کی کار کو بارود سے اڑا دیا گیا جس میں اس کی سترہ سالہ نوجوان بھانجی لامس حسین نجم بھی ہلاک ہو گئی انقلاب کی راہ میں دونوں شہید ہو گئے ——— امر ہو گئے۔

چند روز پیشتر چند دہشت پسند اسرائیلیوں نے اس کے مکان کے باہر کھڑی ہوئی گاڑی میں بم رکھ دیا۔ صبح ½۱۰ بجے غسان اور اس کی بھانجی کہیں جانے کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھے غسان نے جوں ہی گاڑی کو اسٹارٹ کیا، اچانک ایک زوردار دھماکے کے ساتھ گاڑی پرزے پرزے ہو کر فضا میں اڑ گئی غسان اور اس کی بھانجی کے جسم کے ٹکڑے بکھر گئے۔ ان کے مکان کا کچھ حصہ بھی تباہ ہو گیا۔

اسرائیلی دہشت پسند، غسان پر ایک عرصہ سے دانت گاڑے بیٹھے تھے۔ وہ اس سے زیادہ اس کے قلم، اس کے ذہن اور انقلاب کی راہ میں بڑھتے ہوئے اس کے عزائم سے خوفزدہ تھے۔ اس کی تحریروں نے سامراج اور اسرائیلیوں کی خطرناک سازشوں کو ننگا کر دیا تھا۔ وہ مغربی دنیا کو بڑے اثر انگیز انداز سے سمجھا رہا تھا کہ امریکی سامراج اور اسرائیلی گٹھ جوڑ سے عربوں کو ہی نہیں ساری دنیا کو خطرہ ہے اور وہ ساری دنیا کو اس خطرے سے آگاہ کرتے کرتے خود موت کی پر خطر اور گمنام وادیوں میں اتر گیا۔

میونخ کے واقعہ پر مغرب کے اسرائیل نوازوں اور سامراج کے حواریوں نے سینہ کوبی کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ شرارت پسند، اسرائیل کی ہمدردی میں اخبارات نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے۔ مگر اسرائیلی دہشت پسندوں کے اس "سیاہ کارنامے" پر اپنے ہونٹ سی لیے اور مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی۔ یہ مغرب کا پرانا انداز ہے۔ ایشیا، افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور لاطینی امریکہ کے مجبور اور محکوم عوام کے لیے ان کے دل میں ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں ہے۔

اسرائیل کا یہ انتقام ایک فرد یا اس کے خاندان سے نہیں تھا بلکہ فلسطینی تحریکِ آزادی، لبنان اور عربوں کی ترقی پسند تحریک اور آزاد عرب صحافت سے انتقام لیا گیا۔ یہ بھیانک انتقام ایسے لوگوں سے بھی لیا گیا جنہوں نے اپنے فن کے ذریعے انسانیت کے تحفظ کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔

غسان کو قتل کرنے والے دراصل ان سامراجی طاقتوں کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں جو فلسطین کی تحریکِ آزادی کو ہر قیمت پر کچل دینا چاہتے ہیں۔ وہ حریت پسندوں کی طرح کھل کر حملے نہیں کرتے، بزدلوں اور اچکوں کی طرح قتل کے منصوبے بناتے ہیں۔ عربوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک ایسے کئی سیاہ کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ لیکن انہیں اس بات کا بھی تجربہ ہو گیا کہ ایسے بزدلانہ حملوں سے فلسطینی تحریکِ آزادی ختم ہو گی نہ اس میں سستی اور کمی واقع ہو گی۔ بلکہ آزادی حاصل کرنے کی تڑپ پہلے سے زیادہ تیز ہو گی۔ اگر غسان کی موت سے اسرائیلی سمجھتے ہیں کہ میدانِ جنگ اور میدانِ صحافت میں عربوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے تو یہ ان کی سب سے بڑی حماقت ہے ——— آزادی کی جدوجہد جاری

وہ زندہ رہا، لڑتا رہا —— اور شہید ہوگیا



حیفہ کی واپسی کا مصنف اب کبھی حیفہ نہیں دیکھ سکے گا



امس حسین نجیم

رہے گی۔ اس کے خون سے آزادی اور انقلاب کی شمع کچھ زیادہ ہی فروزاں ہوگئی۔ اس کے ساتھیوں میں آگے بڑھنے کا نیا حوصلہ اور جذبہ پیدا ہوگیا۔ اب وہ تابڑ توڑ حملے کریں گے اور ڈھیر ساری فتوحات حاصل کریں گے۔ —— انقلاب کی تاریخ اسی طرح بنتی ہے۔

غسان کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

پیاری بہن —— غسان کا خون، خون کے عظیم چشمے سے جا ملا

پاپولر فرنٹ کے رہنما جارج حبش نے نوجوان انقلابی صحافی اور پاپولر فرنٹ کے اخبار "الھدف" کے مدیر اعلیٰ غسان کنافانی کی موت پر ان کی بیوی کو درد بھرا خط لکھا۔

ہم اس خط کو یہاں نقل کرتے ہیں —— (ادارہ)

* * * *

پیاری اینی

میں اس خیال سے ازحد آزردہ ہوں کہ شاید میں اس مشکل اور تکلیف دہ واقعہ پر انگریزی میں اپنے ان تمام جذبات کو کاغذ پر منتقل نہ کر سکوں جو میں محسوس کر رہا ہوں کیونکہ انگریزی میری مادری زبان نہیں ہے۔

ذاتی طور پر غسان میرے لئے فرنٹ اور تمام لوگوں کے لئے بہت عزیز قیمتی اور نا قابل ضرورت کا نام تھا۔ میں "کنفس" کروں کا کہ یہ حادثہ ہمارے لئے انتہائی تکلیف دہ دھماکہ سے کم ثابت نہیں ہوا۔

اینی ہم سب کو جس میں تم بھی شامل ہو اس سوال کا سامنا کرنا ہے۔ ہمیں ایسے انسان کے لئے ایک کامریڈ کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ جو اس قدر قیمتی اور پر خلوص تھا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے ہمیں تمام تکلیف دہ حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی شخص اس قسم کے حالات سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اس کے بعد ہمیں زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کام کرنا چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ جم کر اور بہتر طریقہ سے لڑنا چاہیئے۔

میری پیاری بہن —— تم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ غسان ایک اعلیٰ مقصد کے لئے لڑ رہا تھا۔ اور تم یہ بات بھی جانتی ہو کہ ہمارے فلسطینی عوام گزشتہ ۵۰ سال سے ایک منصفانہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بالآخر دنیا بھر کے انقلابیوں نے ہماری منصفانہ جنگ کی حمایت کی اس کا مطلب



اینی



جارج حبش

یہ ہوا کہ غسان کا خون، خون کے اس عظیم چشمہ سے جا ملا، جو پچاس سال سے ہمارے عوام جمع کر رہے ہیں۔ جن کی اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس کے عوض آزادی، انصاف اور امن حاصل کر سکیں۔

میں اس بات کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ پوری دنیا کے استحصال زدہ عوام کے تجربات اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہم اسی طرح سے سامراج، صیہونیت اور رجعت پسند قوتوں کو تمام دنیا میں شکست دے سکتے ہیں۔

اینی ——

میں جانتا ہوں کہ غسان کی موت سے تمہیں کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ لیکن اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ تمہارے فیض لیلیٰ اور ہزاروں بھائی بہن ہیں جو فلسطینی محاذ آزادی کے ممبر ہیں اس سے سوا کہ وہ مقصد بھی ہے جس کے لئے غسان لڑ رہا تھا۔

اینی۔ ہمیں تمہاری بلند حوصلگی کی ضرورت ہے۔ اس نازک لمحے میں تمہاری ہمت و جرأت میرے لئے اور ان تمام کامریڈوں کے لئے غیر معمولی شئے ہے۔ جو ایک عظیم اور اعلیٰ مقصد کے لئے برسر پیکار ہیں۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس نازک گھڑی میں میں اور ہلدا تمہارے پاس موجود نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کی وجہ بھی جانتی ہوگی۔ میں اس بات سے ازحد ملول ہوں کہ موت سے قبل غسان کو نہ دیکھ سکا اور نہ اس سے بات کر سکا۔

میں دوبارہ اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ ہمیں تمہارے عزم اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ تم جو کچھ محسوس کر رہی ہو۔ اس میں تم تنہا نہیں ہو اور نہ کبھی اپنے آپ کو تنہا پاؤ گی۔

موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں تم سے ملاقات کا متمنی ہوں۔ ہلدا اور میں ہمیشہ کی طرح تمہارے بھائی بہن رہیں گے۔

جارج حبش

نوجوان صحافی غسان، آزادی کی راہ میں

قربان ہونے والا پہلا اور آخری بیٹا نہیں

کا —— عرب جب سامراج اور اسرائیل سے آزادی حاصل کر لیں گے تو ممکن ہے ان کے وطن کی کسی شاہراہ کا نام اس کے نام پر رکھ دیا جائے۔ اور گائیڈ بس کی روانگی سے پیشتر سیاحوں کو اپنے مخصوص اور تیز تیز لہجے میں اس کے کارنامے سے آگاہ کریں۔ لیکن چند جملوں میں اس کے کارنامے کس طرح بیان کیے جاسکتے ہیں —— ؟

اگر گائیڈ غسان کے کارناموں کو چند جملوں میں سمیٹنا چاہیں تو شاید وہ یہ کہیں گے —— "وہ زندہ رہا —— لڑتا رہا اور —— مرگیا!"

غسان ایک ایسا کمانڈو تھا جس نے دشمن کے خلاف کبھی بندوق استعمال نہیں کی۔ اس کا ہتھیار "بال پوائنٹ پن" تھا۔ اخبارات کے صفحات اس کے محاذ تھے۔ وہ اپنے کالموں کے ذریعے دشمن پر مہلک اور خطرناک حملے کرتا رہا۔ کیا حیفہ میں اب بھی کوئی ایسا عرب موجود ہے جو اس شخص کی یاد میں آنسو بہا سکے جو زندگی بھر حیفہ کو یاد کرتا رہا —— ؟

غسان صرف ایک صحافی ہی نہیں، ممتاز ناولسٹ بھی تھا۔ غیر ملکی اخبارات کے نمائندے اس کے مداح تھے۔ کیونکہ وہ مغرب کے نمائندوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ "پاپولر فرنٹ" کے سرکاری ترجمان کی حیثیت سے وہ غیر ملکی نمائندوں اور نامہ نگاروں کو اپنے مخصوص اور بھرپور لہجے میں جواب دے کر اچھی طرح مطمئن کر دیتا تھا۔ بعض اوقات اس کے بیانات اس قدر جامع اور ٹھوس ہوتے تھے کہ اس کے بعد اخباری نمائندوں کو سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اس کے سیاسی تبصروں میں بالغ نظری، گہرائی، تجزیے اور ٹھوس دلائل بدرجہ اتم موجود ہوتے تھے۔ اس نے سب سے پہلے بیروت کے اخبارات میں لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ پاپولر فرنٹ کے ترجمان اخبار "الھدف" کا ایڈیٹر اور پبلشر بن گیا —— !

"ریٹرننگ ٹو حیفہ" کا مصنف آزادی کے بعد دوبارہ حیفہ نہیں دیکھ سکے گا۔ شاید اس کے جسد خاکی کو دوبارہ حیفہ کے "پردیس" "ایکری" میں جو اس کا وطن ہے، دفن کیا جائے۔

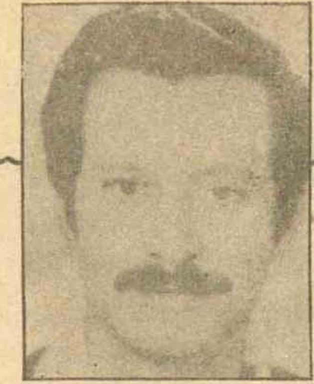
غسان نے ایک ناول لکھا تھا —— "تمہارے لیے کیا بچ گیا" —— اس کے عوام کے لیے ایک چیز بچ گئی ہے۔ یعنی —— غسان کے خون کا انتقام! اسرائیل کو غسان اور اس جیسے ہزاروں، لاکھوں فلسطین کے بیٹوں کے خون کا حساب دینا ہوگا۔

عربوں کی جدوجہد فتح تک جاری رہے گی۔

غسان کے دوست، عزیز اور کامریڈ اس کا انتقام لیں گے اور فتح حاصل کرنے کیلیے آخر دم تک اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔

غسان آزادی کی راہ میں قربان ہونے والا فلسطین کا پہلا اور آخری بیٹا نہیں ہے۔ اس راہ میں عربوں کو ایسے کتنے ہی بیٹوں کی قربانی دینی ہوگی۔ غسان کنافانی ہمیشہ زندہ رہے





غسان کنافانی کی خدمات

—— ایک نظر میں

- —— غسان کنافانی ۱۹۳۶ء میں فلسطین کے ایک علاقہ "ایکری" میں پیدا ہوا۔
- —— ۱۹۴۸ میں اسرائیلی فوج نے اسے ملک بدر کر دیا۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں لبنان پہنچا۔
- —— دمشق کے ایک پرنٹنگ پریس میں اپرنٹس کی حیثیت سے ملازم ہوگیا۔
- —— شام کے مہاجر کیمپ کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔
- —— ۱۹۶۰ء میں کویت سے واپس لوٹا جہاں وہ استاد کی حیثیت سے ایک اسکول میں ملازم تھا۔
- —— عراق چلا گیا اور "عرب نیشنلسٹ موومنٹ" کے ایک ترجمان اخبار "الوحدہ" میں کام کرنے لگا۔
- —— لبنان واپس ہوا اور ایک صحافی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اور ساتھ ہی "عرب قومی تحریک" کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔
- —— غسان ۱۹۵۴ء میں عرب قومی تحریک میں شامل ہوا اور پاپولر فرنٹ کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ چند سال میں وہ "پاپولر فرنٹ" کے ترجمان اخبار "الھدف" کا پبلشر اور ایڈیٹر بن گیا۔ "الھدف" کے علاوہ وہ دمشق کے اخبار "الرائے" کا مدیر، بیروت کے اخبار "الحریا" کا مدیر، "الوحدہ" کا ایڈیٹر ان چیف، بیروت کے اخبار "المحرر" اور "فلسطین" کا ایڈیٹر ان چیف کے علاوہ بیروت ہی کے ایک اور اخبار "الانوار" کے ایڈیٹوریل بورڈ کا رکن بھی رہ چکا ہے۔

افسانے

منیر جہلمی

منزل کہاں ہے تیری

میں خوشی سے جھوم رہا تھا۔ دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا گھر کے دروازے پر پہنچا۔ دستک دی۔ دروازہ کھلا تو سامنے امی کھڑی تھیں ـــ میں شوخ اور چنچل بچے کی طرح امی سے لپٹ گیا ـــ

"امّی میں آج بہت خوش ہوں ـــ بہت خوش" ـــ

"کیوں کوئی خزانہ مل گیا ـــ جو اتنا خوش ہو رہا ہے" ـــ امّی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں امّی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہے ـــ بتاؤں کیا۔"

"ہاں بتاؤ" ـــ امّی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نوکری مل گئی ہے امی ـــ نوکری" ـــ یہ الفاظ میں نے اتنے زور سے کہے کہ پڑوسیوں نے بھی سُن لیا۔

"شکر ہے خدایا۔" تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے" ـــ امّی نے میرا منہ چوم لیا ـــ

"سلمیٰ کہاں ہے" ـــ میں نے امّی سے پوچھا۔

"سو رہی ہے" ـــ بخار ہو گیا ہے اُسے۔

"بخار ہو گیا ہے۔" میں پریشانی میں کمرے کی طرف بھاگا۔ لیکن راستے میں پڑی ہوئی ایک پتھر کی سل سے اس زور کی ٹھوکر لگی کہ میں منہ کے بل گر پڑا ـــ اور پھر میری آنکھیں کھل گئیں۔

اِدھر اُدھر دیکھا تو صحن کے بیچ میں اپنے آپ کو بستر پر پایا ـــ اُہا ـــ کیا خواب تھا ـــ جو بکھر گیا ـــ میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا ـــ اور اُٹھ کر بیٹھ گیا ـــ مشرق سے پھوٹتی ہوئی کرنیں چاروں طرف پھیل رہی تھیں ـــ ایک نئی صبح کا آغاز ہو رہا تھا۔ میں نے بستر کو خدا حافظ کہا ـــ اور سیدھا باورچی خانے میں گیا۔

امّی چائے بنا رہی تھیں۔

"سلیم بیٹے جلدی سے تیار ہو جاؤ ـــ ورنہ ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

اچھا امی ـــ وہ ـــ سلمیٰ کہاں ہے ـــ ذرا اُس سے کہیے میری پتلون استری کر دے۔

اچھا کہہ دیتی ہوں ـــ تم جلدی سے نہا لو۔

کچھ ہی دیر بعد میں تیار ہو چکا تھا ـــ کمرے کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا ـــ اور سوچنے لگا کہ آج کا سفر کہاں سے شروع کیا جائے ـــ سلمیٰ کمرے میں داخل ہوئی ـــ میرے سامنے پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی میز پر ناشتہ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی آپ بہت زیادہ پریشان نظر آتے ہیں ـــ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں ـــ میں اِک دم چونک گیا ـــ نہیں نہیں پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ـــ کچھ تو ضرور ہے ـــ یہ کہہ کر وہ میرے دائیں پاؤں کی طرف جھکی ـــ بوٹ کا تسمہ باندھنا تو آپ بھول ہی گئے۔

اوہ ـ تم رہنے دو میں باندھ لیتا ہوں ـــ ذرا خیال نہیں رہا۔

سلمیٰ یہ برتن سنبھال لو ذرا آ کے ـــ باہر سے امّی کی آواز آئی ـــ سلمیٰ مجھ سے شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔ اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

امّی چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے اندر آئیں اور میرے قریب چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

ناشتہ نہیں کیا تم نے ـــ امّی نے پوچھا ـــ

جی کر رہا ہوں ـــ میں نے چائے کی پیالی اٹھائی۔

رات تم دیر سے آئے تھے ـــ نوکری کا کوئی انتظام ہوا۔

جی ـــ چائے کا گرم گرم گھونٹ میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا ـــ جی نہیں ـــ آج کچھ امید ہے ـــ کام ہو جائے گا۔

کل شام نادر دوکان دار آیا تھا ـــ کہہ رہا تھا۔ ۶۰ روپے کا اُدھار ہو گیا ہے ـــ پہلے اس کی ادائیگی کریں ـــ ورنہ آج سے ادھار بند ہے ـــ اور اس سے بڑی پریشانی سسرال والوں نے ڈال دی ہے ـــ کل وہ لوگ آئے تھے ـ کہہ گئے ہیں کہ لڑکا واپس ولایت جا رہا ہے ـــ اِس لئے اِس ماہ کی پندرہ تاریخ تک لڑکی کو فارغ کر دیں ـــ میں نے ہاں کر دی ہے ـــ سلیم بیٹے دس دن باقی رہ گئے ہیں ـــ اور ہم سلمیٰ کے لئے دو جوڑے کپڑے بھی نہیں بنا سکے ـــ یہ سب کیسے ہو گا بیٹے۔

آپ فکر نہ کریں امی ـــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اُتارا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

کوئی آدھ گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی اتنی ہمت نہ پڑی کہ بس کے قریب جا سکوں۔ جو بس آتی لدی پھندی ـــ آخر مایوس ہو کر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا ـــ میرے سامنے میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک پانچ سالہ بچی کھڑی تھی ـــ اور میری طرف دیکھ رہی تھی ـــ پھر وہ میرے قریب آ گئی ـــ

کیا بات ہے ـــ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

اُس کے ننھے ننھے ہونٹ ہلے ـــ لیکن میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

"کیا بات ہے" ـــ میں نے جھک کر پوچھا۔

اِس دفعہ میرے کانوں تک ایک ہلکی سی آواز پہنچی۔

"خیرات۔"

میں اِک دم سیدھا ہو گیا ـــ اُف خیرات ـــ نئی نسل کے ذہنوں میں بھی زہر بس چکی ہے ـــ خیرات کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا ـــ میں سوچنے لگا۔

بس آ گئی اِس میں کچھ میرے لئے بھی گنجائش تھی میں فوراً بس کی طرف دوڑا ـــ لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ بچی کے سوال کا کیا جواب دوں ـــ بس میں سوار ہو گیا ـــ بہت کشتی لڑی۔ آخر کھڑے ہونے کے لئے ذرا سی جگہ مل گئی ـــ

مسافروں کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں — میں نے ان آوازوں کو غور سے سنا — سیاست کی باتیں تھیں — حکومت سے شکایت — بھوک اور افلاس پر بحث — چور بازاری — حقوق کے کچلے جانے کی شکایت — اور نہ جانے کیا کیا۔ دو بزرگ تو بحث کے دوران لڑ بھی پڑے۔ گرمی سے دم نکل رہا تھا — ہر طرف فوں فوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"ٹکٹ صاحب — کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

میں نے ٹکٹ لیا اور کنڈیکٹر آگے بڑھ گیا — میں نے پتلون کی پچھلی جیب پر ہلکا سا دباؤ محسوس کیا — لیکن میں جان بوجھ کر بے خبر رہا — جب کافی دیر تک کوئی حرکت نہ ہوئی تو میں نے گردن گھما کر کنکھیوں سے دیکھا تو میرے پیچھے ایک لڑکا اپنا ایک ہاتھ پیچھے کئے، سر جھکائے بڑے اطمینان سے کھڑا تھا — پھر اس نے سر اٹھایا۔ آنکھیں چار ہوئیں، لیکن اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کنکھیوں سے دیکھا — لیکن اب منظر کچھ اور تھا — ایک بڑے میاں منہ ہلا رہے تھے لیکن لڑکا اپنی جگہ سے غائب تھا۔ میں نے فوراً نظریں دوڑائیں۔ دیکھا تو صاحبزادے گیٹ کے قریب کھڑے ہیں — میں بھی آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف سرکنے لگا۔

بس اسٹاپ قریب تھا — میرے ساتھ اور بھی مسافر گیٹ کے پاس جمع ہونے لگے۔ بس رکی تو میں پھنس کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے نیچے اترا — اچانک میری نظر اس لڑکے پر پڑی — وہی الجھے ہوئے بال — جسم کے ساتھ چپکی ہوئی دھاری دار قمیض، ٹخنوں سے کوئی چھ انچ اوپر پتلون — سڑک پار کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا — میں نے فوراً اپنی جیب ٹٹولی — بٹوہ غائب تھا — میں فوراً اس کی طرف بھاگا — اور اس سے پہلے کہ وہ سڑک پار کرتا — میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی بہتیری کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

"دیکھو اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔ لاؤ بٹوہ مجھے دیدو"۔ میں نے رعب ڈالا۔

"جاؤ اڑے میرے پاس کوئی بٹوہ وٹوہ نہیں ہے تمہارا"۔ اس نے آنکھیں دکھائیں۔

"دیکھو بھائی اس میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں۔ شاباش دیدو مجھے — میں نے ذرا نرمی سے کہا۔

"اڑے کہہ تو دیا میرے پاس نہیں ہے تمہارا بٹوہ۔ ایسے ہی خالی پیلی رعب جماتا ہے"۔ اس نے بگڑ کر کہا۔

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا بازو موڑ دیا۔ اور پھر اس کی تلاشی لینے لگا — پتلون کی پچھلی جیب کچھ بھاری تھی — میں نے ہاتھ ڈال کر بٹوہ نکال لیا — لیکن وہ بازو چھڑا کر بھاگ گیا۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ میری طرف بڑھ رہے ہیں لیکن میں فوراً سڑک پار کر گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک بڑی عمارت کی پہلی منزل پر تھا — برآمدے میں چند قدم چل کر میں ایک دروازے پر رکا۔ چپراسی اسٹول پر بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

"صاحب اندر ہیں" — میں نے چپراسی سے پوچھا۔

"جی صاحب ابھی تک نہیں آئے" جواب ملا۔

"کب تک آجائیں گے"۔ میں نے پوچھا۔

"کچھ پتہ نہیں ہے بابو"۔

"اچھا میں پھر آجاؤنگا" یہ کہہ کر میں نیچے آگیا۔ اور بغیر کسی پروگرام کے ایک طرف چل دیا۔ گھومتا پھرتا میں شہر کے ایک معروف ترین بازار میں پہنچ گیا۔ یہاں ہر قسم کے لوگ تھے۔ ایک بھکاری سے لے کر بڑے سے بڑے سیٹھ تک — ہر طرف گہما گہمی تھی — میرے آگے آگے ایک برقعہ پوش عورت جا رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی ایک گز کا فاصلہ تھا۔ چلتے چلتے اچانک وہ رکی اور ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

"اوہ — معاف کیجئے" — میں نے معذرت چاہی۔

اس نے نقاب اٹھایا اور مسکرا دی — وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ چند قدم آگے جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی عورت ایک نوجوان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا اب وقت کہاں گزارا جائے۔ سامنے باغیچہ تھا، میں وہاں چلا گیا — ایک درخت کے سائے میں نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ ہوا اچھی چل رہی تھی رات کافی دیر سے سویا تھا اس لیے لیٹے لیٹے میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی تو اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ سڑک پر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم دیکھ کر میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

"اُف — کتنا دردناک منظر تھا۔ کار اور رکشہ کے تصادم میں رکشا الٹ کر بالکل تباہ ہو چکا تھا اور ڈرائیور خون میں لت پت سڑک کے درمیان موت و حیات کی کشمکش میں پڑا تھا۔ بہت سے لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے چند آدمیوں کی مدد سے زخمی ڈرائیور کو ٹیکسی میں ڈالا اور ہسپتال لے گیا۔ کار کے سامنے کا حصہ اندر کی طرف پچک گیا تھا۔ اور بونٹ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ کار کا ڈرائیور اسٹیئرنگ اور سیٹ کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا لیکن ہوش میں تھا — پولیس آگئی اور اس جگہ کھڑے ہوئے لوگوں کو ہٹانے لگی۔ میں فٹ پاتھ پر آیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ دفتر کی طرف چل دیا۔

"صاحب آگئے — ؟" میں نے چپراسی سے پوچھا — !

"جی اندر ہیں !" جواب ملا

چپراسی اندر گیا اور پھر جلد ہی واپس آگیا۔

"کھانے کا وقت ہے — آپ دو بجے کے بعد آئیں"۔ چپراسی نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی، ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں نیچے سڑک پر آگیا۔ فٹ پاتھ پر ایک بڈھا بھکاری جو ایک ٹانگ سے معذور تھا، ہاتھ میں پیالہ لیے بیساکھی کے سہارے کھڑا تھا۔ میں نے اسے دس پیسے کا سکہ دیا — اور سامنے ملباری کے ہوٹل میں جاکر بیٹھ گیا۔

"کھانا لاؤں صاحب ؟" بیرے نے پوچھا۔

"ہاں ! کیا پکا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ایک ہی سانس میں سارے پکوان گنوا ڈالے میں سوچنے لگا کیا کھانا چاہیئے۔

"اُوں .... ایک پلیٹ دال اور روٹی لے آ۔" میں نے آرڈر دیا۔

"بہت اچھا جی — !" بیرا چلا گیا۔

میں کھانا کھا چکا تھا — پھر چائے منگوائی اور دو بجے تک وہیں بیٹھے بیٹھے وقت گزارا — پورے دو بجے میں ہوٹل سے باہر آیا اور دفتر پہنچا۔ دروازے پر چپراسی نہیں تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا تو صاحب کسی لمبے چوڑے حساب میں پھنسے ہوئے تھے — میں ٹیبل کے قریب پہنچا تو صاحب نے سر اٹھایا !

"او۔ مسٹر سلیم ! تم بہت دیر سے آئے ہو۔ میں نے تمہیں صبح نو بجے بلایا تھا"۔ صاحب نے چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"جی ! میں صبح نو بجے یہاں پہنچ گیا تھا لیکن آپ موجود نہیں تھے"۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر سلیم ! تمہارا کام نہیں ہو سکا ہم نے دوسرا آدمی رکھ لیا ہے۔"

"جی ! لیکن آپ نے تو مجھے ....." "ہاں ہاں میں نے ہی تمہیں بلایا تھا — لیکن مجبوری ہے۔ بڑے سیٹھ صاحب کا آدمی تھا، رکھنا پڑ گیا — !" صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں خاموشی سے باہر چلا گیا۔ سڑک پر پہنچا تو یوں لگا جیسے آنے جانے والے تمام لوگ میرا منہ چڑا رہے ہوں

لیکن میں انہی لوگوں کے درمیان چلتا رہا۔ منزل کا کوئی نشان نہ تھا اور میں منزل کو پا لینے کی جستجو میں تھا۔

میری طرح نہ جانے کتنے لوگ مفلسی کی صحرا کی انتہا وسعتوں میں خوشحالی کے سراب کے پیچھے بھٹک رہے ہیں۔ اور جب کوئی افلاس زدہ تھک کر منہ کے بل گر پڑتا ہے تو اہلِ حیثیت اس کی بے بسی کا تماشا دیکھتے ہیں۔ کوئی ہے جو ان ننگی بھوکی اور سسکتی ہوئی زندگیوں کو کسی نخلستان کی راہ دکھائے

اُف ——— کوئی بھی تو نہیں جو انہیں سہارا دے سکے۔

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے میں نہ جانے جذبات کے سمندر میں کہاں تک بہتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر میں نے اپنی منزل کا تعین کرنا چاہا۔ لیکن ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا آخر تھک کر میں ایک ہوٹل میں بیٹھ گیا ——— چائے کا ایک کپ ——— پھر دوسرا کپ!

ہوٹل کے دروازے پر ایک گاڑی آکر رکی۔ ایک نوجوان گاڑی سے باہر آیا اور سگریٹ پان کے کیبن پر جا کر رُکا ——— میں نے اسے غور سے دیکھا اور پہچاننے کے باوجود میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کون ہے۔ میں اٹھا اور جلدی جلدی چائے کے پیسے دے کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔ نوجوان گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں اسے پہچاننے، نہ پہچاننے کی تصدیق کرتا اس نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا ——— یہ میرا کلاس فیلو اور طالب علمی کے زمانے کا بہترین دوست سلطان تھا۔

"اوہ سلیم! تم یہاں ... ؟"

"ہاں میں یہاں ہوں ——— لیکن تم اتنے عرصے سے کہاں ہو .... اور یہ سب ... ؟"

"آؤ میرے ساتھ ... کسی اچھے ہوٹل میں چلتے ہیں" سلطان نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں گاڑی میں بیٹھ گیا ——— کچھ ہی دیر بعد میں سلطان کے ساتھ شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں تھا۔ میں چونکہ کھانا کھا چکا تھا اس لیے صرف چائے پینا پسند کی۔ سلطان کھانا کھا رہا تھا۔

"ہاں تو تم یقیناً یہ جاننا چاہو گے کہ اتنے مختصر عرصہ میں میں کیا سے کیا ہو گیا ——— ؟" سلطان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی معنی خیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا ——— !

ہاں! میں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں لمبا ہی ہاتھ مارا ہے میرے یار نے! کیا ہو رہا ہے آج کل ——— ؟ میں نے پوچھا۔

"بس ——— یہاں سے وہاں ——— وہاں سے یہاں! اتنا ہی کام ہے میرا!

"کیا مطلب ——— ؟"

"نہیں سمجھے ——— اسمگلنگ ——— !" سلطان نے یہ لفظ بڑی آہستگی سے کہا۔

میں چونک گیا۔

"کیوں کیسا ہے ——— ؟" سلطان نے نیپکن سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بہت بُرا ——— تمہیں یہ کام نہیں کرنا چاہیئے!"

"مجھے معلوم ہے ——— لیکن تم نہیں جانتے سلیم میں نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ زمانے کے تھپیڑوں نے مجھے اس راستے پر ڈال دیا ہے ——— اور اگر میں اس راہ پر چل پڑا ہوں تو یہ میری مجبوری ہے ——— تم میرے دوست ہو سلیم ——— ! اگر میں غلطی پر ہوں تو بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو ——— ؟" سلطان نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"میں تو خود راستے کی تلاش میں ہوں میرے دوست! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ——— !"

"مجبور ہو نا ——— ! سلیم! تم آج سے میرے ہمراز ہو ——— چاہو تو تم میرے ہمسفر بھی بن سکتے ہو!" سلطان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

سلطان کے سوال کا کیا جواب دوں۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اور دیر تک میں کوئی بات نہ کر سکا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دن اچھے گزر رہے ہیں!" سلطان نے طنزیہ کہا۔

"نہیں سلطان ——— مجھے تمہاری پیشکش منظور ہے ——— !" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کیا واقعی ——— !" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں ——— لیکن پہلے تمہیں میرے لیے کچھ کرنا ہوگا ——— !"

"کہو ——— !" سلطان نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"میری بہن کی شادی ہے۔ اس کے جہیز کے لیے مجھے کچھ رقم درکار ہے!" میں نے سر جھکاتے ہوئے سلطان سے کہا۔

"بس! اتنی سی بات کے لیے پریشان ہو ——— ؟ کل اسی وقت ——— اسی ہوٹل میں مجھے ملو انتظام ہو جائے گا!

"میں ضرور آؤں گا ——— !" میں نے اطمینان کا سانس لیا!

ہوٹل میں کافی دیر بیٹھنے کے بعد سلطان نے کھانے کا بل دیا اور ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔ پھر دیر تک شہر میں گھومتے رہے۔ سلطان نے ایک چوراہے پر گاڑی روک دی۔

"مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے ——— جہاں فی الحال تمہارا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں ——— دیکھو سلیم بُرا نہ ماننا ——— !" سلطان نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں رکشا لے لیتا ہوں ——— !" اور میں گاڑی سے باہر آ گیا۔

"کل آؤ گے نا ——— ؟" سلطان نے جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ضرور آؤں گا ——— خدا حافظ!"

سلطان چلا گیا تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ پائی کا ایک سکہ "میری مٹھی" میں تھا۔ لیکن میں نے اسے جیب میں ہی رہنے دیا

میری طرح دن بھر کا تھکا ہارا سورج اب افق کی سنہری گود میں ڈھل رہا تھا ——— اور میں ایک نئی منزل کی فکر لیے گھر کی طرف پیدل ہی جا رہا تھا۔

بقیہ: پاکستان میں قومیت کا مسئلہ

کی کھلم کھلا تبلیغ کریں۔

مگر بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے اصلاح پسند (لبرل) بائیں بازو سے متعلق دوست پاکستان کی قومی حقیقت کا سامنا کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں۔ ان کے کثیر القومی نظریے میں سچائی کی تلاش کا جذبہ کارفرما نہیں ہے بلکہ پاکستان کی سیاسی وحدت کو پارہ پارہ کر دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ ان کا اصل مقصد قومیتوں کے حق خودارادی کی حمایت نہیں۔ بلکہ ان کا مقصد ساری پاکستانی قوم کے اس حق خودارادی کی نفی کرنا ہے۔ جس کو ہندوستانی قومیت کے خلاف طویل جدوجہد کے بعد پاکستانیوں نے حاصل کیا۔



ہم لوگ

ضیا سرحدی کی یادداشتیں

(۱۵)



جواہر لعل نہرو نے ہرنی کی موت کو بڑے مصوّرانہ انداز سے بیان کیا

انہیں ایّام میں جب میں جنگ سے متعلق سرکاری قسم کا فلم بنا رہا تھا۔ ریاست گوالیار کے ایک پیر صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ موصوف صرف سادہ لوحوں کے پیر ہی نہیں تھے، ان کو گوالیار سٹیٹ کی گدّی کی روحانی قیادت کا شرف بھی حاصل تھا اور اس لحاظ سے ان کا شمار ریاست کی ان ہستیوں میں تھا جن کے ناموں کے آگے پیچھے دولت مآب، عزت مآب، شرافت مآب وغیرہ وغیرہ جڑ دیا جاتا ہے۔ یہ تو مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ ان پیر صاحب کے اسم مبارک کی آرائش کن کن القابات سے ہوتی تھی مگر ان کے مریدوں اور حواریوں نے پیر صاحب کے آس پاس قدر و منزلت کے جو جال پھیلا رکھے تھے یا یوں کہیے کہ جن جالوں نے ان کو جکڑ رکھا تھا اُن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ پیر صاحب بھی بہ لحاظ قید روایات بہت ہی بڑی چیز ہیں لیکن بایں ہمہ عام طور پر پیر صاحب چھوٹے میاں کہلاتے تھے اور میرا خیال ہے کہ یہ آخر الذکر نام یا لقب یا صفت جو کہہ لیں ان کے حق میں اسم با مسمّا کا کام کرتا تھا اور وہ یوں کہ موصوف کئی لحاظ سے خاصے چھوٹے آدمی تھے۔ ان کی لمبائی بمشکل چار فٹ تھی اور اس پر لاغر اس قدر تھے کہ اُن پر مدقوق ہونے کا شبہ بھی بے جا نہیں سمجھا جا سکتا تھا مگر وہ خدانخواستہ مدقوق ہرگز نہیں تھے اور نہ اُن کو کوئی اور بیماری تھی بلکہ کہنے کو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی جسمانی بسکی کے باوجود حیران کن حد تک مرض پروف تھے۔

اور اس کی ایک نمایاں وجہ یہ تھی کہ حضور ہمیشہ اور بلا مبالغہ بیسیوں معجونیں اور قیمتی کُشتے کھایا کرتے تھے۔ ریاست کی طرف سے ان کے خاندان کو بہت بڑی جاگیر ملی ہوئی تھی اور اس اعتبار سے موصوف خالی خولی پیر ہی نہیں تھے، اونچے جاہ و جلال والے جاگیردار بھی تھے۔ ان رفعتوں کے علاوہ چھوٹے میاں کو ایک امتیازی تمغہ اور بھی حاصل تھا۔ وہ اپنے علاقہ کے ایک زیرک اور کامیاب ترین شکاری بھی سمجھے جاتے تھے۔ ان کی حویلی میں بلا مبالغہ تین یا چار سو شکار کی بندوقیں سجی رہتی تھیں جن کے ساتھ ساتھ خاص کمرہ میں شکار شدہ جانوروں کے ڈھانچے اور کھوپڑیاں وغیرہ بھی نمائش کے لیے ہمیشہ رہتی تھیں۔ موصوف کی بولی بھی خوب تھی۔ شریف عورتوں کو ہمیشہ باندیاں اور طوائفوں



'میرے اندر شکار کے موضوع پر فلم بنانے کی آگ بھڑک اٹھی'

— ضیا سرحدی

کوٹھریاں کہا کرتے تھے۔ جنس اور شہوانیات پر بھی خاصا ملکہ حاصل تھا اور ان سے متعلق راز ہائے دروں پر بڑی چرب زبانی اور حکیمانہ وثوق کے ساتھ گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ سُنا ہے کہ اُن کی غلامی میں مزارعوں اور دیگر کثیر التعداد ملازمین کے علاوہ بیک وقت بہت سی طوائفیں بھی رہا کرتی تھیں اور خواب گاہی خدمات انجام دینے کے علاوہ اُن کو موصوف کی گھڑی ہوئی غزلیں بھی گانا پڑتی تھیں۔ جن کے متعلق ان کے حواری کہا کرتے تھے کہ بہ لحاظ سوز و گداز اُن کی شعریت کا مقام وہی ہے جو شاہ ظفر کے کلام کو میسر تھا۔

جس سلسلہ میں چھوٹے میاں نے مجھ کو شرف ملاقات بخشا تھا اس کا تعلق اُن کے ایک جدید جنون اور شوق سے تھا۔ وہ شکار پر محققانہ انداز سے ایک فلم بنانا چاہتے تھے اور مجھے ملنے کی وجہ یہی تھی۔ اُن سے میری پہلی ملاقات بائیکلہ کے علاقہ میں ایک مشترکہ دوست کے گھر پر ہوئی۔ میرے پہنچنے کے چند ہی لمحوں بعد انہوں نے اظہار خیال کا آغاز کر دیا اور بر سبیل تذکرہ یہ بھی میرے ذہن نشین کرا دیا کہ ان کے مجوزہ شکار کے فلم کی کہانی وہی ہو گی جو انہوں نے خود لکھ رکھی ہے۔ میرے ذمہ صرف ہدایت کاری اور منظر نامہ کی تحریر کا کام ہو گا۔ پھر اس کے فوراً ہی بعد وہ معاملہ کی بات پر آ گئے اور حسب معمول میری ان کی معاملہ کی بات چیت چند روز تک جاری رہی۔ اسی عرصہ میں بہر حال میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں یہ فلم ضرور قبول کر لوں گا۔ قطع نظر اس کے کہ مجھے اس کا محنتانہ کیا ملتا ہے مجھے معلوم تھا کہ ہندوستان میں اس وقت تک اس موضوع پر کوئی مثالی اور حقیقت پسندانہ فلم اوّل تو سرے سے بنی ہی نہیں اور اگر اس موضوع کی طرف کبھی کوئی اشارہ ہوا بھی ہے تو اسے عارضی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اپنے رجحانات اور حقائق پسندی کے تقاضوں کے پیش نظر جن کی آگ اپنی پہلی کہانی من موہن ہی کے زمانے سے میرے اندر موجود تھی۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اگر شکار ہی کے متعلق مجھ کو فلم میں سچ کہنے کا موقع میسر آ رہا ہے تو میں اسے کیوں چھوڑ دوں۔

میں نے بذات خود اگرچہ زندگی میں کبھی شکار نہیں کھیلا تھا اور نہ مجھے اس شغل سے کبھی کوئی لگاؤ تھا بلکہ ایک حد تک مجھے اس کام کے تصوّر سے بھی گھن آتی تھی اور خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تصنیف میں کسی شکاری کے ہاتھوں ایک ہرنی کی دردناک موت کا واقعہ پڑھ رکھا تھا۔ جواہر لال جی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مصورانہ انداز میں بوقت نزع ہرنی کی حسرت مند آنکھوں

نوابوں اور مہاراجوں کی پس پردہ زندگی ○ انتہائی گھناؤنی

کا تذکرہ کیا تھا اور وہ سانحہ میرے لیے بھی حد درجہ المناک تھا پھر بھی شکار پر فلم بنانے کی جو آگ میرے اندر بھڑکنے لگی تھی اس کو شکار برائے شکار کے خیال سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ میرا یہ تازہ جنون اگرچہ بنیادی طور پر ایک REALISTIC فلم بنانے کے ذوق پر مبنی تھا مگر ایک حد تک یہ بھی درست سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کے پس منظر میں ساتھ ساتھ جنگلات کی وہ وسعتیں اور تنہائیاں۔ وہ لطیف خدشات اور ایڈونچر بھی شامل تھے جن سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت مجھ میں فطری طور پر ہمیشہ سے موجود تھی اور ادھر نگار خانوں کی محدود اور لکیر کی فقیر دنیا سے بھی دل برداشتہ ہونے کا اتفاق ہوتا ہی رہتا تھا تو پھر کیا تھا۔

انہی ملے جلے احساسات کی بنا پر میں نے پیر صاحب کا صرف ہدایت کاری کا آفر ہی قبول نہیں کیا بلکہ اُن کی تحریر کردہ کہانی کو بھی میں نے منظوری دے دی۔ مگر کہانی کے علاوہ فلم کے باقی جزویات میں مجھے مکمل آزادی تھی اور ان داتا ہوتے ہوئے بھی پیر صاحب کا اُن میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اُن کے بعد مہینہ بھر کے عرصے میں منظرنامہ جب مکمل ہو گیا تو میں فوراً اداکاروں کے چناؤ پر غور کرنے لگا۔ کہانی کی طے شدہ کردار نگاری کے پیش نظر فی میل لیڈ کے لیے مجھے ایک خاص وضع قطع اور شوخ و شنگ قسم کی لڑکی کی ضرورت تھی اور میری مرہٹہ ہیروئن اس لحاظ سے مناسب نہیں تھی۔ ایک تو اس کے خدوخال اور جسم کی بناوٹ پیش نظر کردار کے متصورہ نقوش وغیرہ سے بالکل مختلف تھے اور مزید برآں یہ دوشیزہ مزاجاً بھی جیسا کہ آپ جان چکے ہیں بہت ہی متین اور مدبر تھی۔ اداکاروں کے چناؤ کے معاملہ میں مجھ کو یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ میں ہمیشہ سے اس پر سیریسلی سوچنے کا عادی رہا ہوں اور اس معاملہ میں جانبداری اور ذاتی لگاؤ کو میں نے اپنے اوپر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔

کبھی کبھار ہو سکتا ہے یہ ہوا ہو کہ CHOICE کی کمی یا فقدان کی وجہ سے میں نے مرضی کے خلاف کسی اداکار کو لے لیا ہو مگر جہاں تک ممکن ہو سکا میں نے اس اہم مسئلہ میں کبھی کوتاہی، عجلت یا بے توجہی سے کام نہیں لیا۔ میں ہمیشہ اس بات کو مناسب اہمیت دی ہے کہ اداکار اپنے اپنے کردار کے لحاظ سے نہ صرف شکل و صورت میں بلکہ ذہنی رجحانات اور نفسیاتی میلان کے نقطۂ نظر سے بھی غایت درجہ مناسب ہوں تو ہی فلم کے حق میں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ میں اس معاملہ میں خانہ پوری کا قائل کبھی نہیں رہا تو بہرحال چند روز کی تگ و دو کے بعد مجھ کو ایک مناسب لڑکی مل ہی گئی۔ وہ ایک غیر فلمی عرب یہودن لڑکی تھی۔ فلوری اس کا نام تھا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ طویل مدت سے بمبئی میں مقیم تھی۔ فلوری کے ساتھ ساتھ ہیرو کے رول کے لیے بھی ایک نیا لڑکا ہی طے کر لیا گیا اور پھر چند ہی روز بعد ہم ہندوستان کی ایک بڑی ریاست میں شوٹنگ کے لیے پہنچ گئے۔

یہاں پہنچنے کے بعد مجھ کو زندگی میں پہلی مرتبہ بہت قریب سے ہندوستانی نوابین اور مہاراجگان کی پس پردہ زندگیوں پر نگاہ ڈالنے کا نہ صرف نادر بلکہ بہت ہی فکر انگیز موقع ملا۔ اس ریاست کے مہاراج خود تو اس وقت شاید فرانس میں تھے مگر ان کے ولی عہد بہادر رونق پر تھے۔ وی آئی پی قسم کے لوگوں کے لیے ریاست کا جو خاص مہمان خانہ تھا رہائش کے لیے ہمیں دلایا گیا تھا۔ اور اس میں پیر صاحب کے علاوہ میں اور فلوری ٹھہرا دیئے گئے تھے۔ باقی سٹاف کے لوگ ایک دوسرے ریسٹ ہاؤس میں ڈال دیئے گئے تھے۔

جس مہمان خانہ میں ہم مقیم تھے اس میں بہت سے کمرے تھے جن میں سے پیر صاحب نے، میں نے اور فلوری نے اپنے لیے ایک ایک کمرہ منتخب کر لیا تھا۔

پیر صاحب کی بدولت ریاست بھر میں ہم جہاں گئے ہم کو ہمیشہ ریڈ کارپٹ ٹریٹمنٹ ملا اور مہمان خانہ میں بھی ہماری خاطر مدارت کے لیے حسین وردیاں پہنے ہوئے بیسیوں بیرے اور ملازمین ہمیشہ حاضر رہے۔ مرغن کھانوں کے علاوہ مختلف قسم کی اعلیٰ شرابیں بھی مہیا تھیں مگر پیر صاحب شراب سے محروم تھے اور فلوری کا ذوق مے نوشی صرف شیمپین کی حد تک محدود تھا اس لیے زیادہ با اثر اور رنگین مزاج شرابوں کی طرف مجھی کو توجہ دینی پڑتی تھی۔

شراب کی محفلیں بسا اوقات فلوری اور مجھی پر مشتمل رہتیں۔ یہ تنہائیاں اور پھر شراب خوردہ تنہائیاں ظاہر ہے کہ ہر طرح سے جنسی فتنہ و فساد کے لیے حد درجہ موزوں تھیں لیکن ان تمام اشتیاق انگیز اور موسیقی بدوش ساعتوں کے باوجود میرے اور فلوری کے درمیان ایک خاصا فاصلہ قائم رہا فلوری کا بمبئی میں ایک بوائے فرینڈ تھا جس کو وہ اکثر یاد کرتی اور اس کی خوبیاں بیان کرتی۔ ادھر میں بھی چونکہ خود کو برابر اپنی مرہٹہ لڑکی کے حق میں کمیٹڈ COMITTED سمجھتا تھا اس لیے میری طرف سے بھی پیش قدمی یا پیش دستی کے سوال کا کوئی امکان نہ تھا لہٰذا دن بھر ہم یکجا کام کرتے اور شام کے بعد اکثر دیر تک صرف شراب نوشی اور خوش گپیوں میں وقت گزارتے۔

چند روز کے بعد ہم ریاست کے دارالخلافہ سے ساٹھ میل دور شیر کا شکار فلم بند کرنے کے لیے مہاراج کی ایک محل نما شکار گاہ میں منتقل کر دیئے گئے۔ شکار گاہ کے دیگر خصوصیتوں پر کچھ کہنا تو غیر ضروری ہے مگر اس کے ایک سب سے نمایاں پہلو کی فلم بندی آنے والے ایک واقعہ کی وضاحت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔

شکار گاہ کے ایک حصہ میں ایک طویل پیسیج تھا جس کے ایک طرف یکے بعد دیگرے چھوٹی چھوٹی ساٹھ یا ستر خوابگاہیں تھیں۔ ان خوابگاہوں کے اندر فرشوں کے سوا تمام جگہ آئینے نصب تھے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آئینوں کی بنی ہوئی وہ تمام چھتیں اور تمام دیواریں کیا نقشہ پیش کر رہی ہوں گی۔ ہم تمام لوگ جب آئینہ خانے کی سیر کے لیے لائے گئے تو ہمارے پیش پیش خود ولی عہد بہادر تھے اور ایک ایک خوابگاہ کا دروازہ کھلوا کر وہ ہمیں اندر کی سیر کروا رہے تھے۔ دس یا بارہ خوابگاہیں جب دیکھ لیں گئیں تو ولی عہد بہادر رُک گئے اور بڑے تفخر کے لہجہ میں بغیر کسی تکلف اور حیا کے کہنے لگے کہ خوابگاہوں کی یہ مسہریاں اگرچہ اس وقت سونی ہیں مگر ہر سال جشن تاجپوشی کے موقع پر پتا جی کے دوست اپنی اپنی پسند کی لڑکیوں کے ساتھ ان خوابگاہوں کو خوب خوب سنوارتے ہیں۔ ان آئینوں کے سینوں میں عشرت کی ہزاروں داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ان آئینوں نے نازک لمحات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اسی موقع پر میں نے نوٹ کیا کہ فلوری کو ولی عہد بہادر کے ان جملوں نے بہت برافروختہ کر دیا ہے مگر وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ خاموش رہ کر دوسری طرف دیکھنے لگ گئی۔

اس رات فلوری کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں نہیں آئی اور معلوم ہوا کہ اس نے اپنے کمرہ ہی میں کھانا منگوایا ہے۔ رات کے دس یا گیارہ بجے ولی عہد بہادر کو جب ڈائننگ ہال سے اٹھنا منظور ہوا تو ہم بھی اٹھے اور اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ میں جب اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو میں نے خلاف توقع فلوری کو اپنے بستر میں لیٹا ہوا پایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے فوراً ان کی وجہ دریافت کی اور فلوری نے بتایا کہ جب وہ اپنے کمرہ میں کھانا کھا رہی تھی تو ولی عہد بہادر کا مصاحب خاص اس کے پاس آیا اور ولی عہد بہادر کی طرف سے بھیجا ہوا تحفہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ یہ تحفہ



فٹے ـــ پیر

گوالیار اسٹیٹ کے رُوحانی قائد

ہیرے کی ایک انگوٹھی کی شکل میں تھا جس کی قیمت بھی مصاحب خاص نے کسی ضرورت اور وجہ کے بغیر ۳ ہزار روپے بتادی تھی۔ فلوری نے کہا کہ وہ تحفہ بھی میں نے واپس کردیا اور مصاحب خاص نے جب ولی عہد کے ساتھ مجھے رات گزارنے کے لیے کہا تو میں نے اس کو باہر نکال دیا اور پھر انگریزی میں فلوری نے آخری جملہ جو کہا وہ یہ تھا۔

HE MAY BE A KING, HE MAY BE ANY DAMN THING. I DONT CARE IF HE THINKS I AM A POOR GIRL AND I WILL FEEL TEMPTED AND AGREE TO SLEEP WITH HIM THEN HE IS DAMN WELL MISTAKEN-SON OF A BITCH.

فلوری سے جب میں نے پوچھا کہ وہ کمرے میں اکیلی رہی ہی کیوں؟ کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں کیوں نہیں آئی تو اس نے نفرت انگیز لہجہ میں ولی عہد کی اس بات کی طرف اشارہ کیا جو اس نے آئینوں والی خوابگاہوں کے متعلق کی تھی۔ اس کے بعد فلوری نے بتایا کہ میں اس ونگر آدمی کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔

تاہم میں نے فلوری سے کہا کہ وہ اپنے کمرہ میں چلی جائے اور اندر سے دروازہ پوری طرح بند کرلے مگر فلوری نے صاف انکار کردیا اور کہنے لگی "میں مرجاؤں گی مگر آج سے اس پاگل خانہ میں اکیلی نہیں سوؤں گی، مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرے کمرے میں بھی بیڈ ایک ہی تھا۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد میں اور فلوری اس میں لیٹ گئے۔

صبح جب ہم اٹھے اور شوٹنگ کی تیاری کرنے لگے تو پیر صاحب بوکھلائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ولی عہد صاحب آپ سے بہت خفا ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فلوری نے مصاحب خاص کی توہین اور تحفہ کی واپسی آپ ہی کے زعم پہ کی ہے اور اُن کے شبہ کو زیادہ تقویت اس خبر سے بھی ملی ہے کہ فلوری نے رات آپ کے ساتھ گزاری ہے۔ میں حیران ہوا کہ اپنی صفائی کیونکر پیش کروں۔ میں ہنوز سوچنے ہی لگا تھا کہ میری انا اور مزید برآں میرے احساس بے گناہی نے مجھ کو کچھ برانگیختہ سا کردیا اور میں نے ایک ہی چست اور ترش جملے میں معاملا کو اپنے طور پر لپیٹ دیا۔ میں نے کہا "یہ سب کا اپنا اپنا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ پیر صاحب فوراً بولے مگر ضیا میاں یہ ریاست کا معاملہ ہے اور یہاں پر تو بڑے بڑے لوگ اپنی بیویاں اور بیٹیاں تک پیش کردیتے ہیں۔ یہ تو خیر ہوئی کہ میری وجہ سے معاملہ دب گیا ہے۔ ورنہ آپ سب کے سب اندر ہوتے تاہم ہمیں اب دس پانچ ہزار کی چوٹ تو پڑ ہی گئی۔ اب دلی سے ایک دو ٹھمریاں بلوا کے ہی بنے گی ورنہ ولی عہد بہادر کی ناراضگی دور ہی نہیں ہوگی اور ہم کو کچھ روز شوٹنگ بھی ابھی کرنی ہے۔ اور اس کے سوا شیر کا شکار بھی تو یہاں سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔ کہیں ہمارے شکار کا فلم ہی نہ دھرے کا دھرا رہ جائے۔

اس کے بعد جتنے دن ہم شوٹنگ کے لیے جاتے رہے ولی عہد بہادر نہ اس میں شریک ہوئے اور نہ پھر کبھی ہم سے ملے۔ ادھر چھ سات روز کی تگ و دو کے باوجود کوئی شیر بھی نظر نہیں آیا مگر پھر بھی دوسرے کچھ جانوروں کا شکار ہم نے ضرور فلم بند کیا۔ بالآخر جب شیر کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی تو ہم دارالخلافہ لوٹ آئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہم کو معلوم ہوا کہ ایک روز پیشتر پیر صاحب کی دعوت پر دلی کی دو خوش رو اور نوجوان طائف زادیاں وہاں پہنچ گئی ہیں اور گزشتہ شب ولی عہد بہادر کی مخصوص عشرت گاہ میں اُن کا گانا بھی ہوا ہے اور ان دو میں سے ایک نے محفل میں برہنہ رقص بھی کیا ہے اور یہ تمام باتیں جب میں سُنتا تھا اور جیسے جیسے ان مہاراجوں اور نوابوں کی عیاشیوں، سیاہ کاریوں، سرکشیوں اور جہالتوں کی داستانیں معلوم ہوتی تھیں بے ساختہ میرے اندر یہ تمنا ابھرتی تھی کہ ان کی زندگیوں پر حقیقت افروز فلم بناؤں۔ ایسا فلم جو ان کو ہندوستان کے غریب محنت کش اور ستم رسیدہ عوام کے سامنے بالکل ننگا کرکے رکھ دے۔ اور وہ زریں نقابیں جو اُن کے اصلی رُوپ کو چھپائے ہوئے ہیں اٹھ جائیں اور لوگ اُن کے حقیقی چہروں کو دیکھ لیں مگر میری یہ تمنا آج تک پوری نہ ہوسکی حالانکہ (شام اودھ) کے نام سے میں نے اس موضوع پر بڑی تحقیق و تصدیق کے ساتھ ایک کہانی بھی لکھی اور ہندوستان کی زرعی اصلاحات کے نفاذ اور نوابین اور مہاراجگان کی معزولی کے پیش نظر ہندوستان کی سیاسی فضا کو ان بے لاگ باتوں کے لیے موزوں بھی پایا۔ یہی نہیں، اس سلسلہ میں ایس مکرمی سے کچھ کاروباری باتیں بھی ہوگئیں۔

مگر انہی ایام میں ان کو اچانک دل کا دورہ پڑ گیا۔ وہ علاج کے لیے جرمنی چلے گئے اور شام اودھ کی کہانی میرے دل کی دیگر لاتعداد شاموں کے اندھیروں میں شامل ہوکر رہ گئی۔ اس کے بعد حالات دگرگوں ہوگئے اور میں پاکستان چلا آیا۔

یہ باتیں بہرحال ضمنی ہیں اور اس قسط میں جس بات کو میں خاص طور پر فوکس میں رکھنا چاہتا ہوں وہ فلوری کے پاس وضع اور اس کے عزت نفس کے شدید احساسات سے تعلق رکھتی ہے۔ فلوری ایک غریب لڑکی تھی اور بمبئی کے ایک متوسط درجہ کے علاقہ میں ایک بہت ہی افلاس زدہ عمارت کے فلیٹ میں رہا کرتی تھی۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ کسی زمانہ میں اس کا باپ گھوڑدوڑ کے دفتر میں ملازم تھا مگر اب وہ بہت بیمار رہنے لگا تھا اور بے کار ہوچکا تھا۔ فلوری نے میٹرک تو کر رکھا تھا مگر اس کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے اس کا سلسلۂ تعلیم جاری نہ رہ سکا۔

مختصر یہ کہ تلاشوں کے باوجود فلوری کو بھی کوئی نوکری نہیں مل سکی تھی اور ان کے گھر آئے دن فاقوں کی یورش تھی۔ یہی دن تھے جب وہ میری نگاہ میں آگئی اور چند روز کی گفت و شنید کے بعد اس نے میرے فلم میں کام کرنا منظور کرلیا۔

شوٹنگ کے دوران ریاست میں جو کچھ پیش آیا، صرف وہی نہیں اس کے علاوہ بھی فلوری کو بقول اس کے بڑی بڑی جرات آزما اور کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا مگر دولت کے لالچ میں آکر اس نے اپنے جسم کا نیلام کبھی نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اگر ولی عہد بہادر کی پیش کش قبول کرلیتی تو ریاست سے واپسی کے وقت اس کے قبضہ میں نہ صرف ہیرے کی وہ تین ہزار والی انگوٹھی ہوتی اور بھی ہزاروں روپے اس کے پرس میں کھنک رہے ہوتے مگر تہی دست لوٹنا اُسے منظور تھا، تہی عزت لوٹنا اس کو گوارا نہیں ہوا۔ فلوری کے کردار کے یہ نقوش، اس کی یہ بے نیازیاں، حسین اور دلنشیں مورتیوں کے رُوپ دھار دھار کر میرے دل میں اُتر رہی تھی اور میں نے اُن کو دُنیائے خیال میں سجدے بھی کرنے شروع کر دیئے تھے۔ مزید برآں اس کے حسین چہرہ میں عنفوان شباب کی دلکش تازگی بھی میرے سامنے تھی اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر اس کا وہ جاذب توجہ انداز حیات، افلاس و فلاکت کے باوجود تفکرات اور پریشانیوں کی زبردست موجودگی کے باوجود وہ اس کی شوخ و شنگ رجائیت۔ غموں میں بسے ہوئے بھی غموں سے اس کی وہ طفلانہ لاتعلقی۔ اُف۔ اُف۔ اُف یہ بجائے خود غضب کی مقناطیسی کیفیات تھیں جن کے آگے

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

اسرائیل کے مظالم نے نازیوں کو مات کردیا

مغربی جرمنی نے فدائین کو دھوکہ دیا

ــــــــــ : محمد صادق جاوید

میونخ کے اولمپک گیمز کے موقع پر فلسطینی چھاپہ ماروں نے نہایت دلیری کے ساتھ اسرائیل کے اولمپک کھلاڑیوں کی رہائشگاہ میں گھس کر دو اسرائیلی کھلاڑیوں کو ہلاک کیا اور ۹ کو یرغمال بنا لیا اور جرمن حکام سے مطالبہ کیا کہ اگر اسرائیل اپنے کھلاڑی واپس لینا چاہتا ہے تو وہ ان ۲۰۰ فلسطینی مجاہدوں کو رہا کرے جن کے ساتھ جیلوں میں انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی انہیں ایک جہاز دیا جائے جس کے ذریعہ وہ میونخ کھلاڑیوں کے دیہات سے عرب ممالک منتقل ہو سکیں۔ جرمن پولیس نے اسرائیلی حکام کو فلسطینی مجاہدین کے مطالبات سے آگاہ کر دیا اور انہیں جہاز مہیا کرنے اور عرب ممالک منتقل کرنے کا وعدہ کر لیا اور اس کے لئے عرب چھاپہ ماروں کو اولمپک گاؤں سے ۲۰ میل دور ایک فوجی ہوائی اڈے پر پہنچا دیا جہاں ان کے لئے ایک ہیلی کاپٹر تیار کھڑا تھا۔ دو عرب مجاہد ہیلی کاپٹر کو دیکھنے کے لئے گئے۔ لیکن جب وہ واپس ہو رہے تھے تو جرمن پولیس نے ان سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ جس کے جواب میں مجاہدوں نے بھی گولیاں چلائیں جس کے نتیجے میں ۹ اسرائیلی کھلاڑی ہلاک اور ۵ فدائین شہید ہو گئے۔ تین فدائین گرفتار کر لئے گئے اور ایک جرمن کانسٹیبل جاں بحق ہو گیا۔

اِس ڈرامے کے پیچھے اسرائیل کا وہ کردار چھپا ہوا ہے جسے اُس نے بڑی طاقتوں کے جھرمٹ میں پناہ لے کر دنیا سے پوشیدہ کیا ہوا ہے۔ اسرائیل کا وجود عرب ممالک کے خلاف مغربی دنیا کی سوچی سمجھی سازش کے تحت عمل میں لایا گیا تھا۔ جس کا مقصد عرب ممالک کو ایک مرکز پر جمع ہونے اور انہیں ایک برادری میں منسلک ہونے سے روکنا تھا۔ اسرائیل کے قیام کے پس پشت جو بھیانک مقصد کارفرما تھا۔ وہ یہ کہ اسرائیل کا وجود عربوں کی آزادی، البقاء اور سالمیت کے لئے چیلنج بنے۔ جسے عربوں نے جلدی محسوس کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک اپنی ذاتی رنجش، اختلافات اور جھگڑوں کے باوجود اسرائیل کے سوال پر ایک سے نظریات رکھتے ہیں۔

اسرائیل کے خلاف یوں تو ۱۹۴۸ء ہی سے عربوں نے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ مگر اس جدوجہد کو جو مقبولیت اور تقویت بیت المقدس پر اسرائیل کے قبضے کے بعد ملی پہلے نہ تھی۔ اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد عربوں پر ایسے ایسے مظالم کئے، کہ نازیوں کے ظلم و ستم بھی ماند پڑ گئے۔ آج بھی ہزاروں مرد، عورتیں، جوان بوڑھے، جواں سال طلباء و طالبات مختلف مقامات پر تنگ و تاریک بیگار کیمپوں میں محبوس ہیں۔ روزانہ بے شمار بے گناہوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور بغیر کسی مقدمے کے وہ جیل میں پڑے رہتے ہیں۔ گزشتہ چند ماہ میں سینکڑوں عربوں کو اسرائیل کے خلاف کسی نہ کسی الزام میں ملوث کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا اور انہیں عدالتی کارروائی کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔

اسرائیلی حکام نے عربوں کے مقبوضہ علاقوں میں ایسے کیمپ قائم کئے ہوئے ہیں جہاں عرب نوجوانوں کو اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ عرب قیدیوں کو تمام کپڑے اتارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ان کے ننگے جسموں پر بید برسائے جاتے ہیں اور پھر زخموں پر نمک چھڑکا جاتا ہے۔ سگریٹ کے جلتے ہوئے ٹکڑے جسم کے مختلف حصوں پر لگائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کو باندھ کر اُن پر کتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ان کی انگلیوں کو دروازوں کی درز میں رکھ کر بُری طرح کچل دیا جاتا ہے۔

وُہ دشمن کے ٹھکانوں کو تباہ کر کے فضا میں تحلیل ہوجاتے ہیں

اور ہاتھوں کے ناخن چمٹیوں سے کھینچ لئے جاتے ہیں۔ عرب خواتین کے کانوں کی کن پٹیوں، چھاتیوں اور شرمگاہوں پر بجلی کا کرنٹ دوڑایا جاتا ہے۔ اسرائیلیوں نے درندگی اور انسانیت سوز مظالم میں ایسے ایسے حربے استعمال کئے ہیں کہ عرب ان سے بدلہ لینے پر مجبور ہیں ... عرب بستیوں کو بموں سے تاراج کر دیا گیا ہے ـــــ آج مجاہدین آزادی جو سینہ سپر ہیں ان کے گھر بار اجڑ چکے ہیں۔ ان کے والدین کو شہید کر دیا گیا۔ ان کے مکانوں اور کیمپوں کو آگ لگا دی گئی ـــــ ان کی نوجوان بہنوں اور ماؤں کو ان کے سامنے ننگا ناچ کروایا گیا اور ان کی عصمت کو تار تار کیا گیا۔ یہ مجاہدین آزادی جنہوں نے اپنی زندگیاں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی آزادی کے لئے وقف کر دی ہیں بے سرو سامانی کی حالت میں مہاجر کیمپوں میں پڑے تھے۔ ان کے سروں پر کوئی پیار و محبت سے ہاتھ پھیرنے والا نہیں تھا۔ ان کی مائیں ان سے جدا ہو گئی تھیں۔ ان کے باپ ان سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے تھے اور ان کی بہنیں ان سے چھین لی گئی تھیں اور وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔

یہ معصوم، خوب صورت اور بھولی بھالی شکل والے بچے جن کو دیکھ کر چوم لینے کو جی چاہتا تھا آج ببر کے شیروں کی طرح دشمن کے ٹھکانوں اور فوجی اہمیت کے مقامات کو تباہ کر رہے ہیں۔ فلسطین کے محاذ آزادی نے انہیں ہر قسم کی تربیت دی ہے اور اب انہیں یورپ کے تمام اہم شہروں میں روانہ کر دیا ہے تاکہ یہ مجاہدین آزادی اسرائیلی سفارت خانوں اور اہم مقامات کو تباہ کر سکیں۔ فلسطین کی محاذ آزادی نے اپنا ایک منشور مرتب کیا ہے۔ جس میں

۱:۔ یورپی ممالک میں صیہونیت کے اہم مراکز سفارت خانوں، اسرائیل کے جاسوسی مراکز کو تباہ کرنا۔

۲:۔ یورپی ممالک میں اسرائیل کے سیاسی پروپیگنڈہ کو بے اثر بنانا۔

۳:۔ یورپی ممالک کے لوگوں کو بتانا کہ فلسطین میں یہودی بے گناہ مسلمانوں پر کیا ظلم کر رہے ہیں۔ ان مجاہدین آزادی کو ایسی تربیت دی گئی ہے کہ وہ کسی بھی اسرائیلی مرکز کو تباہ کر کے غائب ہو جاتے ہیں ـــــ مجاہدین کو کسی معرکے پر بھیجنے سے پہلے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ کسی بے گناہ کو تنگ نہ کریں۔

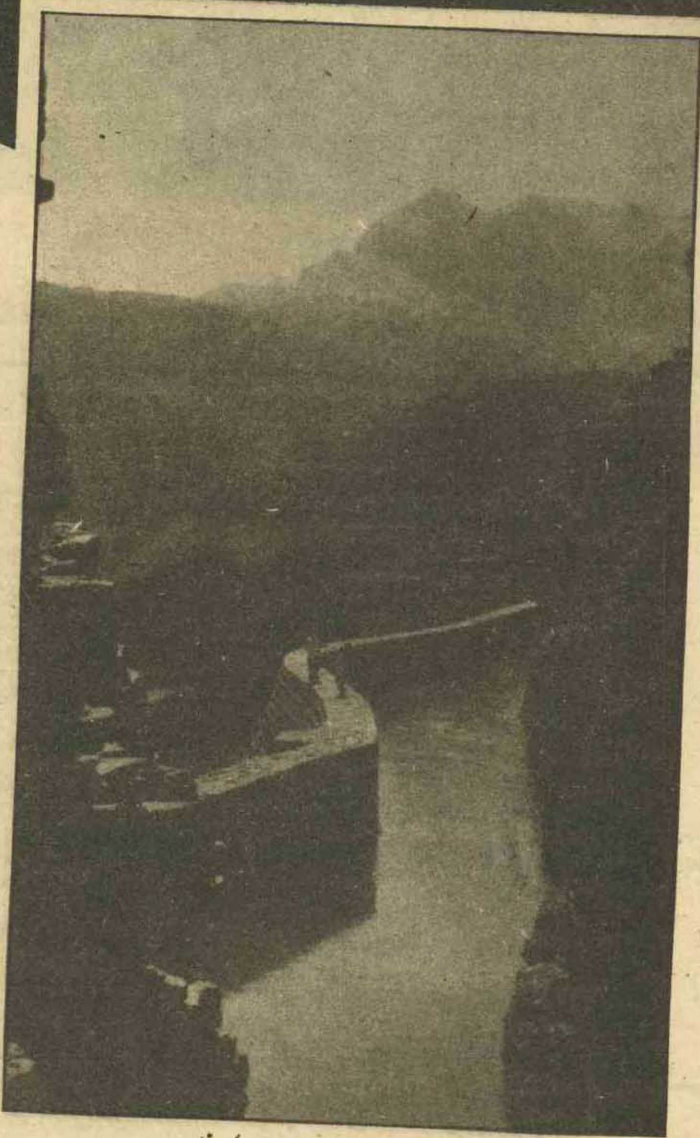
فلسطین کے محاذ آزادی نے ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں کہ سامراج اور اسرائیل حیران ہیں کہ آخر یہ کس چیز کے بنے ہیں۔ بہت سی فلسطینی مجاہد جن میں خالد، طلعت، مجاہد اور عادل کا نام سرفہرست ہے۔ دشمن کے ٹھکانوں کو تباہ کر کے ایسے فرار ہوئے ہیں کہ پولیس ابھی تک حیران ہے کہ انہیں زمین نگل گئی یا آسمان۔ لیکن فلسطین کے محاذ آزادی نے بعد میں یہ اعلان کیا کہ یہ مجاہدین خیر و عافیت کے ساتھ اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے ہیں۔

مغربی جرمنی اسرائیل کو وسیع پیمانے پر فوجی اور اقتصادی امداد دے رہا ہے۔ عربوں کے خلاف جنگ میں مغربی جرمنی نے اسرائیل کی ہر طرح مدد کی۔ جس کا بدلہ لینا مجاہدین آزادی کا فرض تھا اور انہوں نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب فلسطینی محاذ آزادی کی ایک شاخ بلیک ستمبر نے مغربی جرمنی کو الٹی میٹم دیا ہے کہ وہ گرفتار شدہ فدائین اور شہید ہونے والے فلسطینی چھاپہ ماروں کی لاشیں ہمارے حوالے کر دے ورنہ جو کچھ ہو گا اس کی تمام تر ذمہ داری مغربی جرمنی پر ہو گی۔ مغربی جرمنی کو ان ممالک سے سبق حاصل کرنا چاہیئے جنہوں نے مجاہدین آزادی سے دشمنی لے کر اسرائیل کا ساتھ دیا تھا مگر بعد میں اپنے رویہ میں تبدیلی کرنی پڑی۔"

الفتح

سونا مٹی میں دبا پڑا ہے اُسے کون کھُرچ کر باہر نکالے

سفرنامہ چین ۔ (۲)



"سُرخ پرچم نہر" چینی کسانوں کے جذبے کی مظہر

ہمیں چین کی دوستی پر فخر ہے!

دیر تک یہ جُملہ میرے سینے میں چبھتا رہا ۔!

احفاظ الرّحمان

تنگ شیئن کی صبح بہت خوبصورت تھی ۔ پیکنگ میں اب تک بارش نہیں ہوئی تھی ۔ ہر دم حبس سا رہتا تھا ۔ لیکن یہاں آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے ۔ صبح ساڑھے سات بجے ہم نے ناشتہ کیا ۔ ڈائننگ ہال میں بہت سے سمندر پار کے چینی بھی نظر آئے جو دور دور سے اپنے وطن کی بہار دیکھنے آتے تھے ۔ ان دنوں چین کے ہر شہر میں ان کا ہجوم نظر آتا ہے ۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر چیز کو دیکھتے ہیں ۔ نیا چین اس حد تک ترقی کر چکا ہوگا ، انہیں یہاں آنے سے پہلے اس کا گمان تک نہیں ہوتا ۔ انہوں نے پرانا چین دیکھا تھا جہاں قدم قدم پر غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوتے تھے ، جہاں گندے گندے ہاتھ ہر راہ گیر کے آگے اپنی بھوک کی کہانیاں سناتے تھے ، جہاں فحش اشاروں میں عزت کا سودا ہوتا تھا ، پرانے چین کے جسم پر جگہ جگہ ناسور پھیلے ہوتے تھے ، اور نئے چین کی فضاؤں میں نئی زندگی کے نغمے گونج رہے ہیں

صبح ۹ بجے ہم ایک نمائش دیکھنے گئے جس میں سُرخ پرچم نہر کی تاریخ ترتیب دی گئی ہے ۔ دروازے پر پانچ چھ نوجوان لڑکیوں اور وہاں کے منتظمِ اعلیٰ نے ہمارا استقبال کیا یہ لڑکیاں وہاں گائیڈ کی حیثیت سے کام کرتی ہیں ۔ ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس میں دو ہال تھے جن میں نقشے ، چارٹ ، تصویریں مجسمے اور ماڈل رکھے ہوئے تھے ۔ سامنے شیشے کے فریم کے پیچھے مٹی سے بلند عمودی چٹانیں بنائی گئی تھیں ۔ جن پر رسّوں سے لٹکے ہوئے کسان بارودی فلیتہ رکھنے کے لیے کدالوں سے سوراخ کر رہے تھے ۔ بہت خوبصورت ماڈل تھا ۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ مجسمے سچ مچ حرکت کر رہے ہوں میری نظروں میں "سُرخ پرچم نہر" کی دستاویزی فلم کا وہ منظر گھوم گیا ۔ جب بلند عمودی چٹانوں پر رسّوں سے لٹکے ہوئے کسان ہوا میں معلق جھولتے ہوئے آتے اور چٹانوں پر کدال کی ایک ضرب لگا کر پھر ہوا میں معلّق ہو جاتے تھے جب میں نے یہ فلم دیکھی تھی تو میرے بدن میں لہو تیزی سے گردش کرنے لگا تھا اور میں یہ سوچنے لگا تھا کہ وہ لوگ کتنے احمق ہیں جو چین کو ، جو ایسے جیالے انسانوں کا وطن ہے ، اپنے قدموں میں جھکانا چاہتے ہیں ۔

گائیڈ لڑکی جانے کیا کچھ بتائے جا رہی تھی اور میں اپنی سوچوں میں گُم تھا ۔ میرے ملک میں بھی تو اسی گوشت پوست کے انسان بستے ہیں جو ہر وقت قربانیاں دینے کے لیے تیار رہتے ہیں ، وہاں ایسے کارنامے کیوں نہیں ہوتے ؟ وہاں محنت کشوں کی صلاحتیں منظرِ عام پر کیوں نہیں آتیں ؟

"آپ نے سرخ پرچم نہر کی فلم تو دیکھی ہو گی ؟" گائیڈ لڑکی سمجھی کہ شاید میں اس کی کمنٹری میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا ہوں ۔

"جی ، جی ہاں !" میں چونک کر خالی خالی نظر ڈال



چین کے انقلابی کسانوں کا ایک حیرت انگیز کارنامہ

سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔ ہم آگے بڑھ گئے۔

" ہونگ چی چھوٹی (سرخ پرچم نہر) بہت لمبی ہے اور بیچ میں یہ بلند پہاڑ تھائی ہانگ حائل ہے"۔ اس نے چھڑی سے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس لئے ہمیں جگہ جگہ سرنگیں کھودنی پڑیں۔ اگر یہ سرنگیں نہ کھودی جاتیں تو فاصلہ بہت بڑھ جاتا اور وقت کا زیاں بھی ہوتا۔ اس لئے ہم نے سرنگیں بنانے کو ترجیح دی۔"

ان گنت سرنگیں ہیں۔ سب سے لمبی سرنگ چار ہزار میٹر لمبی ہے جو تنگ کان کمیون کے لوچیائے بریگیڈ سے گزرتی ہے۔ اس سرنگ کی کھدائی میں وانگ سٹی چھن نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ جو اب وہاں کی پارٹی برانچ کا ایک رکن ہے (ان کے کارناموں کا ذکر آگے تفصیل کے ساتھ آئے گا) جب اس سرنگ کی کھدائی شروع ہوئی تو کام کی رفتار بہت سست تھی۔ دو طرف سے کام جاری تھا اور وہ بارود کا استعمال بھی کر رہے تھے۔ اس کے باوجود رفتار میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر کسانوں کو بڑی تشویش ہوئی۔ اس رفتار سے تو انہیں اس کی تکمیل میں کئی سال لگ جاتے۔ انہوں نے میٹنگ بلائی اور بحث و مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ اوپر ۳۴ چھوٹے چھوٹے کنوئیں کھودے جائیں اور بیک وقت ۲ جگہوں سے کام شروع کیا جائے۔ اس طرح سرنگ کی کھدائی میں زیادہ کسان کام کرنے لگے اور دیکھتے دیکھتے اس کا کام مکمل ہو گیا۔ ان میں سے سب سے بڑے کنوئیں کی گہرائی ۷۲ میٹر ہے۔ جسے بعد میں میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ نہر پر ضرورت کے لحاظ سے چھوٹے بڑے پل ان گنت تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان میں سے یہ پل سب سے لمبا ہے"۔ لڑکی نے چھڑی سے ایک پل کے ماڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی لمبائی چار سو میٹر اور اونچائی چودہ میٹر ہے"۔ (نہر ان پلوں کے اوپر سے گزرتی ہے)

" نہر کی تعمیر کے دوران ہم نے بارود، سیمنٹ اور چونا خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ دیواروں کے لئے اینٹیں بنانے کے لئے ہم نے چٹانوں کے ٹکڑے استعمال کئے۔ اس کام میں عورتوں نے سرگرم کردار ادا کیا اور تجربے کی کمی کے باوجود انہوں نے بہت جلد یہ فن سیکھ لیا۔"

میری نظر میں ایک بار پھر فلم کے مناظر گھومنے لگے۔ ہر طرف کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پتھروں سے لدی سینکڑوں ہاتھ گاڑیاں نیچے اتر رہی ہیں۔ جوان، بوڑھے اور عورتیں بہنگیاں اٹھائے ادھر سے ادھر آ جا رہی ہیں۔ ایک طرف رولر کو گھما کر بارود بنایا جا رہا ہے۔ چھینیوں پر ہتھوڑوں کی چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ دیواروں پر پتھروں کی ترشی ترشائی مستطیل نما اینٹیں چنی جا رہی ہیں۔ زندگی تیزی سے آگے کی طرف دوڑ رہی ہے۔ محنت کشوں کے ہاتھوں میں کائنات کی تمام وسعتیں سمٹ آئی ہیں۔

" یہ Hollow Dam ہے، اوپر سے دریا گزرتا ہے اور نیچے سے نہر بہتی ہے ——— یوشوئے اتھلا دریا ہے اور موسم گرما میں اکثر خشک رہتا ہے، اس لئے اس کے نیچے نہر تعمیر کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔!"

ہم اور آگے بڑھے اور مٹی سے بنے ہوئے لنگ شئین کاونٹی کے ماڈل کے آگے کھڑے ہو گئے۔ نہر کی شاخیں پوری کاونٹی کے سینے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ کل ۵۰۰ شاخیں ہیں۔ جگہ جگہ برقابی اسٹیشن اور پل بنے ہوئے ہیں۔ بیس سے زیادہ برقابی اسٹیشن ہیں اور پلوں اور پلیوں کی تعداد تو سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

" اصل حصے میں نہر کی رفتار ۲۵ کیوبک کلومیٹر فی سیکنڈ ہے"۔ میرے مترجم شوئے انگ چے نے میرے لئے ترجمہ کیا۔ یہ حساب کتاب تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بس یہ یاد آیا کہ ہمارے یہاں ایسی کوئی نہر نہیں ہے، ایسا کوئی جذبہ نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو بکھرا ہوا ہے مٹی میں سونا دبا پڑا ہے، اسے کون کھرچ کر باہر نکالے۔؟

نمائش میں ہم نے بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ سیکھا۔ آگے ذکر تفصیل سے آئیگا۔ اس لئے میں آگے بڑھتا ہوں۔

جب ہم نمائش دیکھ چکے تو منتظم اعلیٰ اور ہماری گائیڈ نے ہم سے کہا۔ آپ بہت تھک گئے ہوں گے، ذرا سستا لیں۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ چائے سے بھرے ہوئے مگ ہمارے سامنے آگئے۔ چین میں آپ کو ہر جگہ گرم پانی یا چائے پیش کی جاتی ہے۔ یہ یہاں کا پرانا رواج ہے پیاس نہ ہونے کے باوجود میں نے تکلفاً دو تین گھونٹ بھر لئے۔

" اس نمائش کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں ؟"

منتظم اعلیٰ نے بڑی انکساری سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا میں ایک دم ہڑبڑا گیا۔ بولنے کا مرحلہ میرے لئے بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ اتنے بڑے پروجکٹ کے بارے میں تو کوئی ماہر اور تجربہ کار انجینیئر ہی کوئی رائے دے سکتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا۔ اس نہر کی تعمیر عام کسانوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ اسی لئے وہ میری رائے جاننا چاہتے ہیں۔ ایک عام انسان کی حیثیت سے میں نے جو کچھ محسوس کیا تھا انہیں بتا دیا۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا "پاکستان کا نہری نظام کیسا ہے ؟"

میں نے بڑھ چڑھ کر پنجاب کا ذکر کیا اور جب سندھ کے ریگستانوں کا خیال آیا تو خاموش ہو گیا۔

" چین اور پاکستان کے عوام قریبی دوست اور پڑوسی ہیں"۔ منتظم اعلیٰ نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں!"

" جی ہاں!" میں نے کہا۔ "ہمیں چین کی دوستی پر فخر ہے آپ نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔" اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ وہ تو ہمارا ساتھ دیتے ہیں لیکن کچھ ہم ہی مصلحت پسند اور طوطا چشم واقع ہوئے ہیں اور ہمارے سیاست دانوں نے مشرقی پاکستان میں سیلابوں کی روک تھام کے لئے چین کی پیش کش محض اس لئے ٹھکرا دی تھی کہ اس طرح پاکستان میں چین کے اثرات بڑھ جائینگے۔

" ہمیں چین کی دوستی پر فخر ہے!" دیر تک یہ جملہ میرے سینے میں چبھتا رہا۔

(باقی آئندہ)

سوات

خوانین نے کسانوں کو زندہ جلا دیا تھا

عبدالغفار خان

جب سے صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمیعت العلماءٔ اسلام نے اقتدار سنبھالا ہے مزدوروں اور کسانوں پر ظلم و تشدد کی حد ہو گئی ہے۔ اس سے قبل ظلم و تشدد حکومت کی سرپرستی میں کیا جاتا تھا مگر اب سرحد کی حکومت نے یہ کام براہِ راست اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ یوں تو ظلم کی داستانیں سرحد کے ہر حصّہ میں بکھری پڑی ہیں۔ چارسدّہ ، مندنی اور تنگی میں کسانوں پر بے پناہ ظلم کیے جا رہے ہیں اور انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ سنگھاکوٹ، درگئی اور مالاکنڈ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے کسانوں کو شہید کیا گیا، گھروں کو لوٹ کر مسمار کر دیا گیا یا نذرِ آتش کر دیا گیا۔ خوانین ان غریب کسانوں کے مویشی ذبح کر کے کھا گئے، ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ مالاکنڈ ایجنسی میں تو ملیشیا کے دستوں نے باقاعدہ مورچہ بند ہو کر کسانوں پر فائرنگ کی: غریب کسانوں کو شہید کیا گیا اور خوانین کا تحفظ کیا۔

اسی مالاکنڈ ایجنسی میں تھانہ کے مقام پر مرکزی وزیرِ مملکت برائے عوامی امور جناب معراج محمد خان کے جلسۂ عام میں ان پر فائرنگ کی گئی۔ مالاکنڈ ایجنسی ظالم خوانین اور ان کے پٹھوؤں کا گڑھ ہے۔ ملک کے دوسرے حصّوں کے مفرور قاتل اور ڈاکو قانون کی نظروں سے چھپنے کے لیے یہاں خوانین کی پناہ میں رہتے ہیں۔ خوانین انہیں پناہ دیتے ہیں اس لیے وہ خوانین کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ غریب کسانوں اور مزدوروں پر ظلم کرنے میں خوانین کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اور بغیر تنخواہ کے جلّادوں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ خوانین کی اکثریت نیشنل عوامی پارٹی سے تعلق رکھتی ہے اور جمیعت العلمائے اسلام کے مولوی انہیں مذہبی تحفظ دیتے ہیں —— !

۲ ستمبر کو دن کے تقریباً دو بجے جناب معراج محمد خان نے سوات کے بہادر اور غیرت مند مزدوروں کی انقلابی تنظیم "سوات فیڈریشن آف لیبر" کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشان جلسۂ عام سے خطاب کیا۔

معراج محمد خان کو پہلے ہی دھمکیاں دی جا چکی تھیں کہ اگر انہوں نے مالاکنڈ ایجنسی میں تھانہ کے مقام پر جلسہ کیا تو انہیں گولی مار دی جائے گی۔ ان دھمکیوں کے پیشِ نظر ہم سب مزدور جلسۂ عام کی طرف روانہ ہوئے۔

جلسہ گاہ سے تقریباً چار میل ادھر مالاکنڈ ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے جناب معراج محمد خان کی گاڑی رکوائی اور معراج محمد خان سے کہا کہ —— "آپ جلسہ گاہ میں نہ جائیں وہاں مسلح افراد بیٹھے ہوئے ہیں، گڑبڑ کا خطرہ ہے۔"

جناب معراج محمد خان نے کہا کہ —— "آپ اب اطلاع دے رہے ہیں جب جلسہ کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، عوام جلسہ گاہ میں پہنچ چکے ہیں اب جلسہ کیسے روکا جا سکتا ہے؟ آپ کو تو صبح اطلاع دینی چاہئے تھی۔"

جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ کئی مرتبہ پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا ہے کہ —— "جلسہ نہیں ہوگا معراج محمد خان نہیں آئے گا۔" لیکن جلسہ کے منتظمین نے مائیکروفون سے اعلان کیا —— "معراج محمد خان ضرور آئے گا معراج محمد خان بزدل نہیں ہے۔"

جب جلسہ شروع ہوا تو طارق عزیز نے تقریر کی انہوں نے ابھی تقریباً بیس منٹ تقریر کی تھی کہ فائرنگ شروع ہو گئی پہلے فائر سے لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کئی فائر ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ مگر فوراً ہی معراج محمد خان مائیک پر آئے اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ —— "میں نے سنا تھا کہ خوانین کسانوں پر فائرنگ کر رہے ہیں ان پر ظلم کر رہے ہیں اور فائرنگ کر کے ان کی بارات تک روک لیتے ہیں مگر آج میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور اس تمام کارروائی کی رپورٹ بھٹو صاحب کو پیش کی جائے گی" اتنی دیر میں فائرنگ رُک گئی۔ پھر طارق عزیز نے دوبارہ تقریر شروع کی۔ انہوں نے کہا کہ —— اگر خوانین یہی کچھ چاہتے ہیں تو آئندہ ولی خان بھی اٹک عبور نہیں کر سکے گا۔" فائرنگ پھر شروع ہو گئی لیکن اس بار لوگ آرام سے بیٹھے رہے۔ جلسہ جاری رہا۔ معراج محمد خان نے فائرنگ کے دوران اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا —— "میری تمام زندگی مزدوروں اور کسانوں کی خدمت میں گزری ہے اور میں اس راہ میں موت بھی بڑے شوق سے قبول کر لوں گا۔" خوانین سے مخاطب ہو کر معراج محمد خان نے کہا کہ —— "اگر خوانین لڑنا ہی چاہتے ہیں تو میں وزارت سے استعفےٰ دے کر یہاں آؤں گا۔" اس دوران گولیوں کی بارش تیز ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اسٹین گنوں سے گولیاں چلائی جا رہی ہیں۔ جلسہ کا اسٹیج ایک کونے میں تھا اور آس پاس کے مکانوں سے گولیاں چلائی جا رہی تھیں جن کے نشانات اب بھی اسٹیج کے آس پاس دیواروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ فائرنگ براہ راست معراج محمد خان اور طارق عزیز پر کی جا رہی تھی لیکن وہ کونے میں ہونے کی وجہ سے بچ گئے۔ جلسہ میں سے کسی نے فائر نہ کیا جب کہ کافی لوگوں کے پاس اسلحہ موجود تھا۔

جب گولیاں زیادہ برسنے لگیں تو نوجوانوں نے معراج محمد خان اور طارق عزیز کو زبردستی ایک قریبی حجرے میں پہنچایا۔ یہ فائرنگ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوئی۔ ایک طرف نیشنل عوامی پارٹی کے خوانین نے اخباری بیانات کے ذریعے معراج محمد خان اور طارق عزیز کو دھمکیاں دیں کہ انہیں صوبہ سرحد میں جلسہ نہیں کرنے دیا جائے گا۔ جب وہ دورے پر آئے تو وزیرِ اعلیٰ مفتی محمود پنجاب کے دورے پر چلے گئے۔ اور ولی خان تو ویسے ہی "لندن پلان" میں مصروف تھے۔ فائرنگ کے دوران مالاکنڈ ایجنسی کا پولیٹیکل ایجنٹ جلسہ گاہ کے سامنے ایک مکان کی چھت پر بیٹھا تھا جب فائرنگ شروع ہوئی تو وہ غائب ہو گیا۔

ٹوچی اسکاؤٹ ملیشیا کے میجر ارشد نے انہیں بہت تلاش کیا کہ ان سے احکامات لے کر فائرنگ بند کرائی جائے اور فائرنگ کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے۔ مگر پولیٹیکل ایجنٹ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پھر میجر ارشد معراج محمد خان اور طارق عزیز کو سوات ہوٹل سیدو شریف چھوڑ کر واپس آ گئے۔

ہم حیران ہیں کہ صدر بھٹو کیوں خاموش ہیں۔ ایک مرکزی وزیرِ مملکت پر فائرنگ کی گئی لیکن صدرِ مملکت خاموش ہیں؟ پھر ہم مزدور کسان کیا امید کر سکتے ہیں، ہم پر ہونے والے مظالم اور تشدد کی باز پرس کون کرے گا جب کہ صدرِ مملکت اپنی کابینہ کے وزیر پر بھی فائرنگ کا نوٹس نہیں لیتے تو پھر غریب کسان مزدوروں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔

یوں تو صوبہ سرحد میں ہر جگہ مزدوروں اور کسانوں پر ظلم ہو رہا ہے مگر اس کی بدترین مثال سوات ہے جہاں مزدوروں کو بے روزگاری کی شکل میں ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ سوات

میں سلک کی ۱۰۰ فیکٹریاں ہیں جن میں سے تقریباً ۳۰ فیکٹریاں بند پڑی ہیں۔

"النور سلک ملز مزدور یونین کو عدالت سے ایک لاکھ تیس ہزار کی ڈگری ملی مگر اس کی وصولی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا بلکہ مل مالک بر سر عام مزدوروں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ سلطان سلک ملز، سی سلک ملز، فلک شیر سلک ملز (صوبائی اسمبلی کے ممبر محمد رحمان کی ملز ہے) اور عالم سلک ملز سے مزدوروں کی دھڑا دھڑ چھانٹی کی جا رہی ہے۔ کوئی بھی سہولت نہیں دی جاتی، سرکاری چھٹیاں یا تنخواہ نہیں ملتیں ڈسپنسری اور طبی سہولت کوئی نہیں ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ مالاکنڈ ڈویژن میں لیبر قوانین کا نفاذ کیا جائے مرکزی وزیر محنت رانا محمد حنیف نے اعلان تو کیا ہے مگر ابھی تک لیبر قوانین کا نفاذ نہیں ہوا۔

شموزئی تحصیل مٹہ صوبہ سرحد کا دوسرا ہشت نگر ہے۔ یہ وہی مشہور علاقہ ہے جہاں گوجروں کو زندہ جلایا گیا۔ خوانین نے ان کے گھروں کو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مٹہ کے سامنے خاکستر کر دیا اور ان کے مویشی ذبح کرکے کھا گئے صرف اس لیے کہ انہوں نے بے گار دینے سے انکار کیا۔ اپنی آبائی زمینوں سے بے دخل ہونے سے انکار کیا اور یہی انکار ان کا جرم بن گیا۔ یہ خوانین ظلم و ستم کے لیے مالاکنڈ ڈویژن میں مشہور ہیں۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ مزدور کسان پارٹی کے گرفتار شدہ لیڈروں، محمد خان کاکا، ایڈیٹر ہفت روزہ صنوبر، قادر خان، شیر علی بابا اور شاہجہان خان ایڈووکیٹ کو فوراً رہا کیا جائے اور تمام کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ افضل بنگش اور شیر علی باچا کے وارنٹ گرفتاری واپس لیے جائیں۔

تھانہ مالاکنڈ ایجنسی میں مرکزی وزیر مملکت برائے عوامی امور جناب معراج محمد خان اور طارق عزیز پر جلسہ عام میں فائرنگ کی تحقیقات ہائی کورٹ کے جج سے کرائی جائے۔

سوات میں بند ملیں فوری طور پر کھولی جائیں تاکہ ہزاروں بے روزگار مزدور برسر روزگار ہو سکیں۔ چھانٹی بند کی جائے مزدوروں کے مقدمات کے فیصلے جلد از جلد کیے جائیں

مالاکنڈ ڈویژن میں لیبر قوانین فوری نافذ کیے جائیں۔

النور سلک ملز، الامین سلک ملز، سی سلک ملز، سلطان سلک ملز کے مزدوروں کے مسائل جلد از جلد حل کیے جائیں

مالاکنڈ ایجنسی کو ختم کرکے یہاں پاکستان کے قوانین نافذ کیے جائیں اور مالاکنڈ ڈویژن سے ایف سی آر ختم کی جائے

کنڈیارو

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور

غلام مصطفےٰ شیخ

کہا جاتا ہے کہ "یہ عوامی دور ہے۔ موجودہ حکومت مزدوروں اور ہاریوں کی حکومت ہے" یہ الفاظ حکومتی پارٹی کے کارکن بھی کہتے ہیں اور وزراء حضرات بھی! یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کسی مزدور رہنما اور ٹریڈ یونین کے سرگرم کارکن کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا لیکن ——— "ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور" کے مصداق حکومت اور حکومتی پارٹی کے کارکنوں کے تمام دعوے باطل ہیں۔

ضلع نواب شاہ کے شہر نوشہرو فیروز میں گزشتہ سال لوکل کونسلر ورکرز یونین کا قیام عمل میں آیا۔ اس یونین کی اکثریت خاکروبوں پر مشتمل ہے۔ یونین کے قیام کے بعد اس نے اپنے جائز مطالبات تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ انتظامیہ سے کئی بار گفت و شنید کی۔ انتظامیہ نے زبانی وعدے بھی کیے اور تحریری بھی لیکن بعد میں وہ اپنے وعدوں سے مکر گئی۔ سوائے ایک دو مطالبات کے باقی سب جائز مطالبات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ لہٰذا مجبور ہو کر یونین نے ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء سے نوشہرو فیروز اور مورو سب ڈویژن میں ہڑتال کر دی۔ ہڑتال کے دوران انتظامیہ نے کچھ تحریری وعدے کیے اور معاہدہ کیا لیکن چند دنوں کے بعد ہی انتظامیہ نے اپنے ایک ایجنٹ، جو حکومتی پارٹی نوشہرو فیروز میں ایک اہم عہدے پر فائز ہے، کے ذریعے لوکل کونسلر ورکرز یونین کے صدر علی احمد میمن پر مقدمہ دائر کروا دیا اور انہیں دفعہ ۱۰۷/۱۵۱ تعزیرات پاکستان کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

علی احمد میمن کی گرفتاری کس طرح عمل میں آئی جیل میں ان کے ساتھ کیسا سلوک برتا گیا یہ ایک طویل کہانی ہے جس کا ذکر پھر کبھی کیا جائے گا۔ قصہ مختصر جب علی احمد میمن جیل سے رہا ہوئے تو انتظامیہ اپنے وعدے سے منکر ہو گئی اس معاندانہ رویہ پر بھی یونین نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ باہمی گفت و شنید سے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی انتظامیہ پھر بات چیت پر راضی ہو گئی۔ تین مرتبہ مصالحتی اجلاس کے لیے تاریخیں مقرر کی گئیں لیکن ہر بار اجلاس ملتوی ہوتے رہے کیونکہ انتظامیہ یونین کو توڑنا چاہتی ہے ——— !

انتظامیہ کی اس روش کو دیکھتے ہوئے یونین نے ۷ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مرتبہ انتظامیہ نے عیارانہ انداز میں ۹ ستمبر کو مورو میں ایک اجلاس بلوایا مگر اس یونین کو شرکت کی دعوت نہیں دی۔ ۷ ستمبر کو یونین کے فیصلے کے مطابق محراب پور، کنڈیارو، بھریا روڈ، ٹھارو شاہ اور نوشہرو فیروز میں ہڑتال کر دی گئی دوسری جانب ۹ ستمبر کو مورو میں انتظامیہ کا اجلاس ہوا۔ فیصلے کیے گئے لیکن یہ فیصلے خفیہ رکھے گئے۔ اجلاس کے فوراً بعد انتظامیہ گفت و شنید کرنے کی بجائے ہڑتال کو ناکام بنانے میں مصروف ہو گئی۔ ۱۰ ستمبر کو دوسرے شہروں سے خاکروب لا کر ہڑتال کو ناکام بنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ حربہ محنت کشوں نے اپنے اتحاد کی بدولت ناکام بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی انتظامیہ اور پولیس نے یونین کے عہدے داروں اور سرگرم کارکنوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے گھروں کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ جہاں بھی کوئی خاکروب نظر آیا پولیس اسے خوب زدوکوب کرتی اور پھر حوالات میں بند کر دیتی۔ غرضیکہ ایوبی اور یحییٰ خانی دور آمریت کی یاد تازہ کر دی گئی۔ اس معاملے میں کنڈیارو اور ٹھارو شاہ کی پولیس پیش پیش رہی۔

۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ء کو پیپلز پارٹی سندھ کے جنرل سیکرٹری عبدالفتح میمن نے یونین کے عہدیداروں سے ملاقات کی۔ اور ان کے جائز مطالبات تسلیم کروانے کا یقین دلایا چنانچہ یونین نے ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا لیکن پولیس تشدد آمیز کارروائیوں سے باز نہیں آئی۔ چنانچہ یونین کے صدر جناب علی احمد میمن کی قیادت میں ایک وفد ۱۳ ستمبر کو گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور سے ملا اور وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو سے بھی ملاقات کی۔ دونوں نے اس معاملے کی تحقیقات کا وعدہ کیا لیکن ابھی تک انتظامیہ اور پولیس اپنی روش پر قائم ہے۔ محنت کشوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔



جھنگ

سیاسی عناصر تاریخی شکست کا قرضہ چکانا چاہتے ہیں

رشتما

پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی چیئرمین سید رضا عسکری نے کہا کہ ہم اس لئے پنجاب کا دورہ کر رہے ہیں۔ تاکہ طلباء کو ملک کے خلاف ہونے والی سازشوں سے آگاہ کر سکیں کیونکہ طلباء کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنا کر کچھ سیاسی عناصر اپنی تاریخی سیاسی شکست کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ بات گذشتہ رات پیپلز پارٹی سٹوڈنٹس فیڈریشن جھنگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام میں کہی جو ایل بازار میں منعقد ہوا۔ انہوں نے کہا کہ کچھ نام نہاد طالب علم رہنما جو کسی تعلیمی ادارہ کے باقاعدہ طالب علم نہیں بلکہ عوام دشمن سیاسی جماعتوں کی شہ پر حکومت کو دھمکیاں دیتے پھر رہے ہیں۔ لیکن حکومت کو مرعوب ہونے کی بجائے طلباء مزدوروں اور کسانوں کو اعتماد میں لینا چاہئیے۔ انہوں نے کہا کہ ہم حکومت اور عوام کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو ناکام بنانے کے لئے متحد ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت کو مزدوروں کسانوں پر تشدد کی بھی اجازت ہے۔ انہوں نے حکومت کو انتباہ کیا کہ اگر اس نے اصلاحات پر عمل درآمد نہ کیا اور محنت کشوں کے مسائل پر توجہ نہ دی۔ تو تاریخ کا فیصلہ حکومت کے خلاف جائے گا۔ انہوں نے طلباء سے کہا کہ ہم قائد اعظم کا ہر اول دستہ ہیں۔ اور ہمیں اپنے قائد کے ورثہ کی حفاظت کرنا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو کبھی بھی پاکستان سے مخلص نہ تھے اور کچھ بھٹکے ہوئے غریب طالب علموں کی مجبوریوں کو خرید کر اپنے پاکستان دشمن نظریات کی تکمیل چاہتے ہیں۔ لیکن وہ طالب علم جو گذشتہ عوامی تحریک میں مزدوروں اور کسانوں سے خود کو مربوط کر کے پیپلز پارٹی کو ایوان اقتدار تک پہنچا سکتے ہیں۔ وہ ملک کے غیر مراعات یافتہ طبقوں کو ساتھ لے کر اپنی مادر وطن کے ناموس کا تحفظ بھی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان جس خطۂ زمین کا نام ہے۔ وہ کسی شخص کی جاگیر نہیں۔ بلکہ کروڑوں محنت کشوں کا وطن ہے اور اس کی حفاظت بھی لوگ کر سکتے ہیں۔ پی ایس ایف فیڈریشن کے مرکزی وائس چیئرمین اور لاء کالج کے طالب علم رہنما جناب عزیز نیازی نے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ یہاں دولت معیار عزت ہے۔ جب تک محنت کو معیار عزت تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اور عوامی معاشی اصلاحات نافذ نہیں کی جائیں گی۔ پاکستان کے دشمنوں کو سازشوں کے مواقع ملتے رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ جس معاشرہ میں ہر چیز جنس بازار بن جائے اسے غیر طبقاتی سماج میں تبدیل کرنے کے لئے مزدوروں کی انقلابی قیادت میں کسانوں اور طالب علموں کو سخت عوامی انقلابی جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے خلاف سازشیں کوئی نئی بات نہیں بلکہ پاکستان اپنے قیام کے وقت سے لے کر آج تک سازشوں کا شکار رہا ہے پاکستان کے خلاف سازشیں کبھی لندن میں کبھی ماسکو، واشنگٹن اور کبھی نئی دہلی میں تیار کی جاتی ہیں۔ لیکن ماضی میں ہمیشہ مزدوروں اور کسانوں کو حقیر سمجھ کر انہیں ان سازشوں سے آگاہ نہیں کیا گیا جس کا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اگر اب بھی اسی عمل کو دہرایا گیا اور سازشیوں کا سواد کھا کر محنت کشوں کا استحصال جاری رکھنے کی کوششیں کی گئیں تو کئی بنگلہ دیش وجود میں آجائیں گے۔

سرحد کے حکمران پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ انتخابات کے دوران حدیث رسول مقبولؐ کا حوالہ دے کر کہا کرتے تھے کہ زمین اس کی ہے۔ جو اسے زندہ کرے۔ لیکن اقتدار میں آنے کے بعد سرحد میں زمین کو زندہ کرنے والے کسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے کسانوں کا پانی بند کر کے کربلا کی یاد تازہ کر دی گئی ہے۔ کسانوں کے مکان کو آگ لگا دی جاتی ہے لیکن سرحد کے حکمرانوں کی لاٹھی گولی اور غنڈے تاریخ کے دھاروں کو نہیں بدل سکتے۔ انہوں نے کہا کہ مفتی صاحب اور ولی خان کے لاڈلے خوانین تاریخ کے عبرت ناک انجام سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں پیپلز پارٹی سے محبت ہے۔ کیونکہ اس کی تعمیر میں ہمارا خون شامل ہے۔ اور اسے عوام کا وسیع تر سیاسی اعتماد حاصل ہے۔ لیکن ہم اس پارٹی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ خود کو انقلابی بنیادوں پر منظم کر کے عوام کی مایوسیوں کو دور کرنے اور اپنے رشتے اس ملک میں طاقت کے ماخذ عوام سے استوار کرے۔ اگر پارٹی نے مزدوروں اور کسانوں سے اپنے دیرینہ تعلقات کی تجدید نہ کی تو پھر اقتدار پر قابض لوگوں کو یاد رکھنا چاہئیے کہ ان کی کرسیوں کے نیچے اس ملک کے کروڑوں غریب عوام سسک رہے ہیں جو پارٹی کے با اعتماد اور مخلص دوست ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم رہنما باسط دھیڈ نے پنجاب یونیورسٹی میں جماعت اسلامی کی غنڈہ گردی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ جماعت اسلامی کس طرح طلباء کو خرید کر خونی ڈرامہ کھیلنا چاہتی ہے۔ جلسے سے دوسرے طالب علم راہنماؤں عبدالحی خان، عبدالکریم عابد۔ رؤف طاہر نے خطاب کیا اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض شمیم پرویز نے سرانجام دیئے۔

کوٹری

آدھ گھنٹے کی چھٹی بھی تنخواہ سے کاٹ لیجاتی ہے

الفتح رپورٹ

محمد صدیق جنرل سیکرٹری سندھ ٹوبیکو ورکرز یونین کوٹری نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ انتظامیہ نے جوائنٹ ڈائریکٹر لیبر حیدر آباد کے ایوارڈ کے نتیجے میں منظور شدہ ڈسٹ الاؤنس کی ادائیگی ابھی تک نہیں کی ہے۔ یاد رہے کہ یہ ایوارڈ ۱۲ اگست ۱۹۷۲ء کو دیا گیا تھا۔ جنرل سیکرٹری نے الزام لگایا کہ انتظامیہ نے موجودہ لیبر قوانین کے تحت ابھی تک مزدوروں کی گروپ انشورنس نہیں کرائی ہے اور اس طرح قانون کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوئی ہے۔ جنرل سیکرٹری نے مزید بتایا کہ عام طور پر مزدوروں کو یونیفارم جولائی کے پہلے ہفتے میں مل جایا کرتی تھی مگر جب سے یونین وجود میں آئی ہے، انتظامیہ طرح طرح کے بہانے تراش کر مشکلات میں اضافہ کر رہی ہے اور اس کے نتیجے میں ابھی تک مزدوروں کو یونیفارم نہیں دی۔ مقصد یہ ہے کہ یونین کو بدنام کیا جائے اور مزدوروں کو آمادہ کرایا جائے کہ یونین ان کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہی۔

جنرل سیکرٹری نے بتایا کہ یونین سے پہلے اگر مزدور ایک یا دو گھنٹے کے لیے چھٹی مانگتے تھے تو رخصت گیٹ پاس کے ذریعے دی جاتی تھی اور تنخواہ وغیرہ کی کٹوتی نہیں کی جاتی تھی لیکن اب ایک یا دو گھنٹے حتیٰ کہ آدھ گھنٹے کی رخصت مانگنے پر بھی چھٹی کا فارم پُر کرایا جاتا ہے۔ اور پھر تنخواہ سے کٹوتی کی جاتی ہے۔ نیز اگر تنخواہ سے پیشگی

باقی ص ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



حکومت کا ہر شعبہ توجّہ کا متقاضی ہے

ہفت روزہ الفتح کے شمارہ نمبر ۱۹ (۲۱/۲۸ ستمبر ۷۲ء ۱۹) میں وزارتِ اطلاعات کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس طرف بہت تاخیر سے توجہ دی ہے۔ صرف وزارتِ اطلاعات پر کیا منحصر ہے حکومت کا ہر شعبہ، ہر محکمہ اس بات کا متقاضی نظر آتا ہے کہ آپ عوام کو اس کے بارے میں حقائق سے آگاہ کریں۔

عوام نے جن امیدوں سے، جن توقعات کو مدِنظر رکھ کر پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا تھا اِن میں سے ایک بھی توقع ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ عوام نماز بخشوانے گئے تھے مگر الٹے روزے ان کے گلے پڑ گئے۔ حکومت نے جتنی اصلاحات کی ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان پر نہ تو کوئی عملدرآمد ہونے کی توقع ہے نہ ہی ان کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے کی توقع ہے۔ یہ اصلاحات گرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کو سہارا دینے کے لیے کی گئی ہیں، محض لیپا پوتی اور عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے کی گئی ہیں —— !

زرعی اصلاحات کو ہی لے لیں۔ ان اصلاحات کا بڑے بڑے دعووں کے ساتھ اعلان کیا گیا کہ "یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا" .... مگر کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ صوبہ پنجاب کی حکومت ہو یا سندھ کی یا کسی دوسرے صوبے کی، ان اصلاحات میں ترمیم در ترمیم کر چکی ہیں۔ سو ایوب شاہی کی زرعی اصلاحات اور اس نام نہاد عوامی حکومت کی زرعی اصلاحات میں اب ذرّہ برابر بھی فرق نہیں رہا۔ میں خود ایک کاشت کار کا بیٹا ہوں۔ میری آدھی عمر کھیتی باڑی میں گزری ہے۔ میں نے ایوب کی زرعی اصلاحات کو دیکھا اور ان اصلاحات کا بھی مطالعہ کیا ہے کہ اب کسان ہماری پہلے سے کہیں زیادہ جاگیردار و زمیندار کا غلام بن جائے گا۔

ایک طرف حکومت کا یہ حال ہے، دوسری طرف انقلاب پسند لوگ ابھی تک ڈرائنگ روموں کی زینت و آرائش میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہی وقت ہے جب کہ ان کو عوام کے درمیان آنا چاہیے —— !

مارکس و انجلز ہوں یا لینن اور ماؤزے تنگ! انہوں نے کسانوں اور ہاریوں کو پرولتاریہ کا سب سے بڑا معاون و مددگار بتایا ہے۔ صنعتی مزدوروں کے درمیان ہمارے یہاں بہت سے انقلابی دوست کام کر رہے ہیں مگر اس مظلوم و مجبور طبقے میں جانے کا ابھی تک کسی کو خیال نہیں آ رہا۔ حالانکہ دیہات اس بات کے متقاضی ہیں کہ انقلابی لوگ کسانوں میں جا کر کام کریں اور ان کی قوت کو مجتمع کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صنعتی مزدور شہر میں ہوتے ہیں اور شہر آسائش و آرام کے لوازمات سے پُر ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کے مقابلے میں کسان و مزدور دیہات میں ہیں، جہاں زندگی واقعی تکلیف دہ اور آرام و آسائش کے لوازمات سے قطعاً خالی ہے۔ انقلاب پسند دوست اگر صرف شہروں میں ہی منڈلاتے رہے اور دیہات کی طرف رُخ کرنے سے ڈرتے رہے تو ہرگز انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کو چاہیے کہ وہ دیہات کا رُخ کریں .... اور اب ضرورت بھی اس بات کی ہے۔ شہروں سے جو کچھ ملنا تھا مل چکا ہے۔ اب انقلاب کے راستے دیہات سے ہو کر گزرتے ہیں۔ اگر "انقلاب .... انقلاب" کے نعرے لگانے والے مخلص ہیں اور واقعی کام کرنے کے موڈ میں ہیں تو بہت جلد دیہات کی طرف کُوچ کریں، دیہات ان کو آواز دے رہے ہیں۔ موجودہ حکومت جاگیرداروں کی حکومت ہے جس کا طبقاتی مفاد اس میں ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیہاتوں پر جاگیرداروں کا تسلّط قائم کرے اور مضبوط کرے۔ اب یہی کچھ ہو رہا ہے۔

دیہاتوں میں جہالت ہے اور وہاں توہمات کا دَور دَورہ ہے۔ حکومت مذہبی جنون پھیلا کر یہی کچھ کرنے پر تُلی ہوئی ہے کہ دیہات کے اَن پڑھ عوام اس کے مذہبی نعروں میں اپنی طبقاتی جدوجہد کو بھول جائیں اور اپنے مسائل سے آگہی حاصل نہ کر سکیں۔ مولانا کوثر نیازی اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ دسمبر ۷۰ء کے انتخابات میں مذہبی جنون کو —— شکست ہوئی تھی۔ یہ جنون مرا نہیں تھا بلکہ سرد ہو گیا تھا۔ آپ اگر یہ کہتے ہیں کہ مذہبی جنون مر چکا ہے تو سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مذہبی جنون مرا ہرگز نہیں، سرد ہو گیا ہے، کوثر نیازی اس کو ہوا دے رہے ہیں۔ بیشتر اس کے کہ یہ لاوا پھر پھوٹ نکلے، آپ اس کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ پیپلز پارٹی کے اندر اور باہر ہر جگہ ایک ایسا مضبوط گروپ مخلص اور دیانتدار افراد کا تشکیل دیں جو اس جنون کا سختی سے مقابلہ کر سکے۔

پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت نے سخت مایوس کیا ہے کنونشن لیگ اور پیپلز پارٹی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ آپ کے نوٹس میں آیا ہو گا کہ بیشتر کنونشن لیگی پیپلز پارٹی میں گھس آئے ہیں۔ بہت سے جاگیردار اور زمیندار اس کے رکن بن چکے ہیں۔ ڈیرہ غازی خان کے تمام بدنام کنونشن لیگی اب پیپلز پارٹی میں ہیں۔ سردار بلخ شیر مزاری برادر شیر باز خان مزاری پیپلز پارٹی میں داخل ہو چکے ہیں۔

سردار بلخ شیر مزاری اور کنونشن لیگ کے وہ بدنام افراد جنہوں نے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پیپلز پارٹی کے اراکین کو دبانے کی کوشش کی تھی، آج منظورِ نظر بنے ہوئے ہیں مگر ان مخلص اراکین اور نمائندوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں جنہوں نے ذاتی رشتے داریاں، تعلقات، غرض کہ ہر چیز اور اپنی جان تک کو داؤ پر لگا کر پیپلز پارٹی کے لیے دن رات کام کیا۔ جن پیروں اور میروں کو غریب کارکنوں نے شکست دی آج وہی

پیر اور میران کارکنوں کو آڑے ہاتھوں لے رہے ہیں۔ مگر ان غریب کارکنوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کافر، لعین اور کمین کا خطاب دینے والے پیر و میر تو وزیروں، مشیروں اور صدر سے براہ راست مل آتے ہیں مگر مخلص کارکنوں کو ملاقات کے لیے وقت ہی نہیں دیا جاتا غریب آدمی کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ غریب کارکن نے جو کچھ کیا اس امید پر کیا کہ کوئی آفت آئی تو پارٹی اور پارٹی کی قیادت اِن کی دستگیری کرے گی مگر اب تمام آرزوئیں اور امیدیں خاک میں مل چکی ہیں۔ وہ عزیز رشتے دار، جن کو غریب کارکنوں نے پیپلز پارٹی کے لیے دھتکار دیا تھا، آج قہقہے لگاتے ہیں کہ لو اپنا انجام دیکھ لو اور کام کر لو پیپلز پارٹی کے لیے!

میری درخواست ہے کہ کارکنوں کی اس حالت زار کو پارٹی کی قیادت کے نوٹس میں لائیں۔ کارکن تو آج بھی مخلص ہیں اگر وہ پہلے پارٹی کے لیے دن رات کام کر سکتے تھے تو یقیناً اب بھی کام کر سکتے ہیں مگر ان کو اچھا صلہ ملنا چاہیئے، ان کی آواز کی کوئی شنوائی ہونی چاہیئے! جتنے مخلص کارکن پیپلز پارٹی کو ملے تھے اتنی مخلص قیادت بھی اس پارٹی کی ہوتی تو آج پارٹی کا یہ حال نہ ہوتا۔

روزمرہ کی اشیائے صَرف کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں مگر حکومت اس طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی۔ بے روزگاری نے عوام کا ناطقہ بند کر رکھا ہے مگر کوئی تدارک نہیں ہو رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تماشہ کیا ہے۔ حج کے لیے تو ۲۸ کروڑ روپے کا زرمبادلہ خرچ ہو سکتا ہے مگر غریب مزدوروں کی تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا کہ خزانہ خالی ہے۔ دوسری بڑی بڑی عیاشیاں ہو رہی ہیں مگر قومی خزانہ خالی نہیں ہوتا، خزانہ خالی ہوتا ہے تو صرف مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافے سے! ایوبی دور کی طرح گشتی نمائشیں لگ رہی ہیں۔ ملک کے آثارِ قدیمہ پر اور دیگر فضولیات پر خزانہ لٹ رہا ہے مگر ضروری امور کے لیے رقم نہیں۔ ایک طرف غریب ننگے بھوکے عوام ہیں دوسری طرف ثقافتی طائفے "ناچ گا" رہے ہیں، "ریڈیو" اور "ٹی وی" پر "انقلاب آگیا ..." "عوامی انقلاب آگیا" کے غلغلے اور طنطنے ہیں مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ سیٹھ احمد داؤد اب بھی سیٹھ احمد داؤد ہے اور حاکمِ وقت ہے۔

آج مردہ پیروں فقیروں کی قبروں کی مرمت اور ان پر سونے چاندی کے کڑھے ہوئے غلاف چڑھانے کے لیے تو حکومت کے پاس بہت پیسہ ہے مگر گوشت پوست کے بنے ہوئے زندہ انسان کے سر چھپانے کے لیے مکان اور تن ڈھانپنے کے لیے ہماری "عوامی حکومت" کے پاس سستا کپڑا فراہم کرنے کے لیے پیسہ نہیں۔ اسکول اور کالج مہینوں سے بند پڑے ہیں۔ دوسری طرف سے مضحکہ خیز دعویٰ یہ ہے کہ "تعلیم عام ہو گئی ہے اور کالج و سکول قومیانے سے طلبا کی فیسیں کم ہو گئی ہیں۔" ایسی فیسیں کم کرنے سے کیا فائدہ جبکہ تعلیمی اداروں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ پولیس کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے صرف اس لیے کہ پولیس عوام پر زیادہ سے زیادہ مظالم توڑے، کوئی جمہوری آواز بلند ہو تو اسے کچلا جا سکے۔ رشوت کھلے بندوں لی جا رہی ہے، ہر طرف سفارش اور اقربا پروری کا دور دورہ ہے:... مگر ان عام آدمیوں کے مسائل کی طرف کسی کو توجہ کرنے کی فرصت نہیں۔ یہ میرا ایک چشم دید واقعہ ہے کہ ایک لڑکا کل تک معمولی کلرک تھا مگر صرف تین ماہ کی مدت میں فرسٹ کلاس گزیٹیڈ افسر بن چکا ہے کیونکہ اس کا "پوا" چل گیا ہے۔

چہروں کے بدلے جانے سے نظام نہیں بدل جاتا۔ نظام بدلنے کے لیے انقلاب کی ضرورت ہے اور انقلاب کے لیے مخلص قیادت اور مخلص کارکن ہونے چاہئیں۔ اگر آپ انقلاب کے سچے دوست ہیں تو اس طرف توجہ دیں اور مخلص قیادت کو منظر پر لائیں۔ کارکنوں کی آج بھی کوئی کمی نہیں۔

ان حالات کو دیکھ کر جو کہ موجودہ وقت میں یہاں ہیں یقین کریں کبھی دل یہ چاہتا ہے کہ ..... کاش! ہم بھی احمد داؤد، اے کے سومار وغیرہ ہوتے کہ اس دیس سے کہیں اور نکل جاتے جس طرح کہ یہ لوگ آہستہ آہستہ حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر معہ اہل و عیال جا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ ان لوگوں نے جاپان، ہالینڈ اور دوسرے یورپی ملکوں میں اپنی فیکٹریاں اور کارخانے بنا لیے ہیں اور بہت سارے سرمایہ دار جلد از جلد اس ملک سے جانے والے ہیں۔ (فیاض احمد)

سید محمد تقی نے پھر ڈنڈی ماری

الفتح ۷-۱۴ ستمبر ۷۲ء کے شمارے میں اظہار خیال کے طور پر سید محمد تقی نے اردو اور سندھی کے اعداد و شمار کے مسئلہ پر میرے اور ڈاکٹر فیروز احمد کے اعداد و شمار کو اپنے مطلب کے معنی پہنا کر الفاظ کے ہیر پھیر کے ذریعہ ایک دفعہ پھر "پرنالہ وہیں گرے گا" کا راگ الاپنے کی کوشش کی ہے۔

گو کہ سید صاحب نے ۶۵ فی صد شہری آبادی اور شہری آبادی کے اردو داں ہونے کی غلطی تسلیم کرتے ہوئے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ سندھ میں سندھی زبان بولنے والوں کا تناسب ۵۶٫۴۸ فی صد ہے۔ اِس طرح اردو دانوں کی اکثریت کی دلیل سے تائب ہو گئے لیکن ایک نئے انداز سے سندھی کے ساتھ اردو کو شامل کرنے کے لئے نیا میدان تراش لیا ہے۔ خیال کی آزادی اُن کا حق ہے، لیکن کسی دوسرے کے الفاظ کو اُس کے نفسِ مضمون سے علیحدہ کر کے اپنی مرضی کے معنی پہنانا بددیانتی کے مترادف ہے اور اسی لئے ایک دفعہ پھر ان کی جانب سے پیدا کردہ غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہو گیا ہے۔

میں نے اپنے مضمون شائع شدہ الفتح ۱۷ / ۲۴ / اگست ۱۹۷۲ء حیدرآباد ضلع کی جو اردو بولنے والوں کا کراچی کے بعد دوسرے نمبر کا ضلع ہے، اِس کی مردم شماری کے اعداد و شمار پیش کئے تھے۔ جس کی رو سے حیدرآباد میں سندھی زبان کا تناسب ساٹھ فی صد ہے۔ جب کہ ڈاکٹر فیروز احمد نے پورے سندھ کے اعداد و شمار کے ذریعہ کراچی کی شمولیت کے ساتھ سندھ میں سندھی زبان کا تناسب ۶۲ فی صد اور اردو کا ۹ فی صد لکھا ہے۔ ہر اعداد و شمار اپنے نفسِ مضمون کے تعلق سے لکھے گئے ہیں۔ سندھ کے تناسب کو دانستہ طور پر حیدرآباد ضلع کے تناسب کے مقابلے پر رکھ کر غلط ثابت کرنے کی کوشش کو ان کی نا سمجھی سمجھنا چاہیئے یا... سید صاحب نے ۵۶٫۴۸ فی صد سندھی زبان کو علیحدہ کر کے بقیہ زبانوں کو سندھی کے مقابلے میں رکھ کر ایک دفعہ پھر ڈنڈی مارنے کی کوشش کی ہے۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ سندھی زبان کے علاوہ بلوچی، بروہی، راجستھانی وغیرہ صرف بولیاں ہیں اور سندھ کے اندر ان بولیوں والے لوگ بھی سندھی زبان میں ہی نہ صرف تعلیم حاصل کرتے ہیں بلکہ سندھی کو بطورِ مادری زبان مثال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

۱۹۶۱ء کی مردمِ شماری کے لحاظ سے سندھی بطور زبان اختیار کئے ہوئے افراد کی تعداد درج ذیل ہے۔

۱۔ سندھی	۴۷۸۳۲۹۳
۲۔ بلوچی	۵۳۶۵۴۴
۳۔ بروہی	۱۶۶۵۴۵
۴۔ راجستھانی	۱۱۷۷۴۳
۵۔ متفرق	۱۳۹۲۸۳
میزان کل	۵۷۴۳۴۰۸
	تقریباً ۸۲،۶۷ فی صد

اِس طرح سندھی بطور زبان استعمال کرنے والوں کا آبادی میں تناسب دو تہائی سے زائد ہے۔ جب کہ اردو بولنے والے

صرف ۲۹ فی صد یعنی ایک تہائی سے بھی کم ہیں۔ اس طرح ۴۳ فی صد میں شریک گیارہ زبانیں بولنے والوں کی چودھراہٹ اردو کو دی جاتے، ٹھوس جواز نہیں رکھتی۔

اگر غیر سندھی زبان بولنے والوں پر سندھی کا نفاذ شہری حقوق سے محروم کرنے کے مترادف ہے تو کیا اردو و سندھی دونوں کے نفاذ کے بعد بھی بلوچی، بروہی، پنجابی، پشتو، گجراتی، راجستھانی وغیرہ بولنے والوں کو شہری حقوق سے محروم کرنے کے مترادف نہ ہوگا۔

جہاں تک اُردو کے "قومی زبان" ہونے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اردو کوئی قوم نہیں ہے اور نہ ہی کسی خاص قومی خطہ کی اکثریتی زبان ہے۔ پاکستان میں اردو کی حیثیت مقبولِ عام رابطے کی زبان کی ہے۔ اور اس کی یہ حیثیت ہم سب کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ جہاں تک زبان سیکھنے کے سلسلہ میں سہولیات کا تعلق ہے یقیناً اس کی تائید کی جانی چاہیئے اور سندھی نہ جاننے والوں کو اس کا موقع ضرور ملنا چاہیئے۔

مارکسزم کے اصولوں کے مطابق زبان کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اگر سید صاحب مارکس، اینگلز، لینن یا اسٹالن کے نام یا تصانیف کے مطالعہ سے الرجک ہیں تو پھر جدلی مادیت کی اس سائنس کو بنیاد نہیں بنانا چاہیئے جسے مارکس، اینگلز، لینن اور اسٹالن جیسے مارکسٹوں نے ترقی دی ہے تو بہتر ہوگا کہ موصوف خود اپنے نظریات اختراع کریں تاکہ کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ رہے۔

(احسان عظیم صدیقی۔ کوٹری)

بقیہ

خیبر سے کیماڑی تک

مانگتے ہیں تو انکار کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اکثر فیکٹریوں اور ملوں میں دستور ہے کہ پیشگی رقم ہر ماہ کی بیس تاریخ سے دی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مزدور پریشانی کا شکار بنتے ہیں۔ جنرل سیکرٹری نے الزام لگایا کہ انتظامیہ نے معاہدہ کے مطابق مزدوروں کو ترقیاں نہیں دیں بلکہ من مانے طریقے پر مستحق افراد کے بجائے اپنے پسندیدہ اشخاص کو ترقیاں دے کر معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ جنرل سیکرٹری نے مطالبہ کیا کہ مزدور دشمن کارروائیاں فوراً بند کی جائیں۔

بقیہ

ضیاء سرحدی کی یادداشتیں

مجھ ایسے حسن پرست کا جھک جانا موسیقی حسن کے ان سرگوں پر مر مٹنا میرے لیے بعید از قیاس نہیں تھا مگر اپنا یہ سارا رقّو عمل میں نے اپنا سینہ ہی میں مستور رکھا اور بڑے ضبط سے کام لے کر اس کو حتی الامکاں اپنے دل کی گہرائیوں سے آگے ہرگز ابھرنے نہیں دیا۔

آخر میں جب ہم بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور فرسٹ کلاس کے ایک کوپے میں سفر شروع کیا۔ تب فلوری نے ایک بات کہہ دی اور میں دفعتاً یہ بات محسوس کرنے لگا کہ جیسے میں دو عورتوں سے، دو حسین انسانوں سے بیک وقت محبت کر سکتا ہوں۔ میرے دل کے ایک حصہ میں اس وقت میری مرہٹن محبوبہ تھی اور دوسرے حصہ میں اب فلوری براجمان ہونے لگ گئی تھی۔

فلوری نے کہنا شروع کیا تھا "کہ تمہارا مجھ پر ایک قرض ہے اُس رات کا جو شکارگاہ میں میں نے تمہارے ساتھ ایک ہی بیڈ میں گزاری تھی۔

میں نے بے قرار ہوکر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

فلوری نے بحاگا کہا۔ "تم بہت شریف انسان ہو اور میں تمہاری بہت عزت کرنے لگی ہوں۔ اس رات اگر مجھ سے تم میری "عورت" مانگنے کا تقاضا کر بیٹھتے تو شاید میں زیادہ دیر تک انکار نہ کر سکتی۔ اِس لیے کہ وہ تنہائی اور تمہاری ہمدردیوں کی وہ گرمی، مجھ کو آمادہ کر لینے کے لیے کچھ کم نہیں تھیں اور پھر یہ بھی فیکٹ ہے کہ میں ورجن نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ تم نے مجھے خریدنے کے لیے کوئی تحفہ بھی نہیں دیا تھا۔ پھر کیا تھا تم خاموش پڑے سوتے رہے اور میں رات بھر تمہاری شرافت کو دل میں جگہ دیتی رہی۔ بس اب میں اور کیا کہوں۔

یہ کہہ کے اُس نے میرے پہلو میں سر رکھ دیا اور وہیں سے میں نے یہ ماننا شروع کر دیا کہ مجھے اس سے بھی محبت ہو گئی ہے اور وحشت دل مجھ کو اس گلشن میں بھی لے آئی ہے

بقیہ - ایوانِ صنعت و تجارت

پیش کیا۔ اس میں مینجنگ کمیٹی کے حالیہ انتخابات کی دھاندلیوں کا پردہ چاک کیا گیا تھا اور عبدالرحمٰن، حاجی حبیب عرف مٹھو سیٹھ کی بدعنوانیوں اور الیکشن کے تسلیم شدہ اصولوں کی پامالی کا ذکر کیا گیا تھا۔ مسٹر حسین ناصر نے "الفتح" کے مضمون کو اپنی بنیاد بنا کر مینجنگ کمیٹی کے حالیہ انتخابات کے بارے میں سوالات کیے اور اس فراڈ الیکشن کو کالعدم قرار دینے پر زور دیا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ مٹھو سیٹھ کے حواریوں نے شور مچایا کہ ـــــــ "بیٹھ جاؤ ـــــــ خاموش رہو ـــــــ یہ سب بکواس ہے۔" لیکن مسٹر حسین ناصر بولتے رہے اور وضاحت کرنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ اپنی بدعنوانی پر پردہ ڈالنے کے لیے ایوانِ صنعت و تجارت کے صدر نے رولنگ دی کہ ـــــــ "مسٹر حسین ناصر آپ کے سوالات کا جواب نہیں دیا جا سکتا: کیونکہ آج کے ایجنڈے پر یہ بات نہیں ہے، آپ کو سات دِن پہلے نوٹس دینا چاہیئے تھا۔" حالانکہ یہ رولنگ سراسر غلط تھی۔ "انتخابات ایوانِ صنعت و تجارت ۱۹۷۲" کا ذکر ایجنڈے پر موجود تھا۔ صدر کی رولنگ کے بعد اس سلسلے میں سوالات نہیں کیے جا سکتے تھے اس لیے مسٹر حسین ناصر خاموش ہو گئے۔

صدر کی رولنگ کے بعد قاسم عثمان کنڈا والا نے شرمندہ ہونے کی بجائے "الفتح" کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی بے شرمی سے کہا کہ ـــــــ "ہم نے اس اخبار والے کو اپنی کسی پارٹی میں نہیں بلوایا ہوگا اس لیے ناراض ہو گیا۔ آئندہ کسی پارٹی میں مدعو کر کے اسے راضی کر لوں گا۔"

سیٹھ قاسم عثمان کنڈا والا ـــــــ "ٹٹ پونجیا" سرمایہ دار ـــــــ اور لطیف ابراہیم جمال کے پٹھو! سنو!! ـــــــ "الفتح"، کسی میر خلیل الرحمٰن، ہارون، لاری یا این پی ٹی کا اخبار نہیں جسے تم خرید سکو! یہ خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان ہے، مزدوروں اور کسانوں کا اخبار ہے، اس کے کارکن سود و زیاں کے سب پیمانے توڑ چکے ہیں، انہیں تمہاری پارٹی میں شرکت کی کوئی خواہش نہیں۔ وہ اپنی دال روٹی میں خوش ہیں ـــــــ سیٹھ لطیف کے چمچے! شاید تم نہیں جانتے کہ تمہارے آقا سیٹھ لطیف ابراہیم جمال کے بھی "ان داتا" ولیکا نے فوجی آمریت سے گٹھ جوڑ کر کے "الفتح" پر بغاوت کے الزام میں مارشل لاء کے تحت مقدمہ قائم کرایا تھا لیکن مُنہ کی کھانی پڑی! تم اپنی حیثیت کو نہ بھولو ـــــــ جب ولیکا بھی ہمارا بال بیکا نہ کر سکا تو تم "کِس کھیت کی مُولی ہو!"

ایوانِ صنعت و تجارت کراچی بدعنوانیوں کا گڑھ بن چکا ہے، وزارتِ صنعت و تجارت اور ڈائرکٹر آف ٹریڈ آرگنائزیشن کو اس کی تحقیقات کرنی چاہئیں۔

مصنف ذوالفقار علی بھٹو

عظیم المیہ

تیسرا ایڈیشن چھپ چکا ہے

ـ ۱ روپے

مجلد چرمی ــ ... پے

شوکت صدیقی

کا

شہرۂ آفاق ناول

خدا کی بستی

شائع ہو گیا ہے

اپنے قریبی بک اسٹال طلب کریں

صفحات : ۷۰۴ قیمت : ۱۲ روپے

سرورق

چار رنگوں میں

الفتح مطبوعات ۸۰ ڈی ۔ نرسری ، کمرشیل ایریا ۔ کراچی

الفتح

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
5-12 OCT-1972.